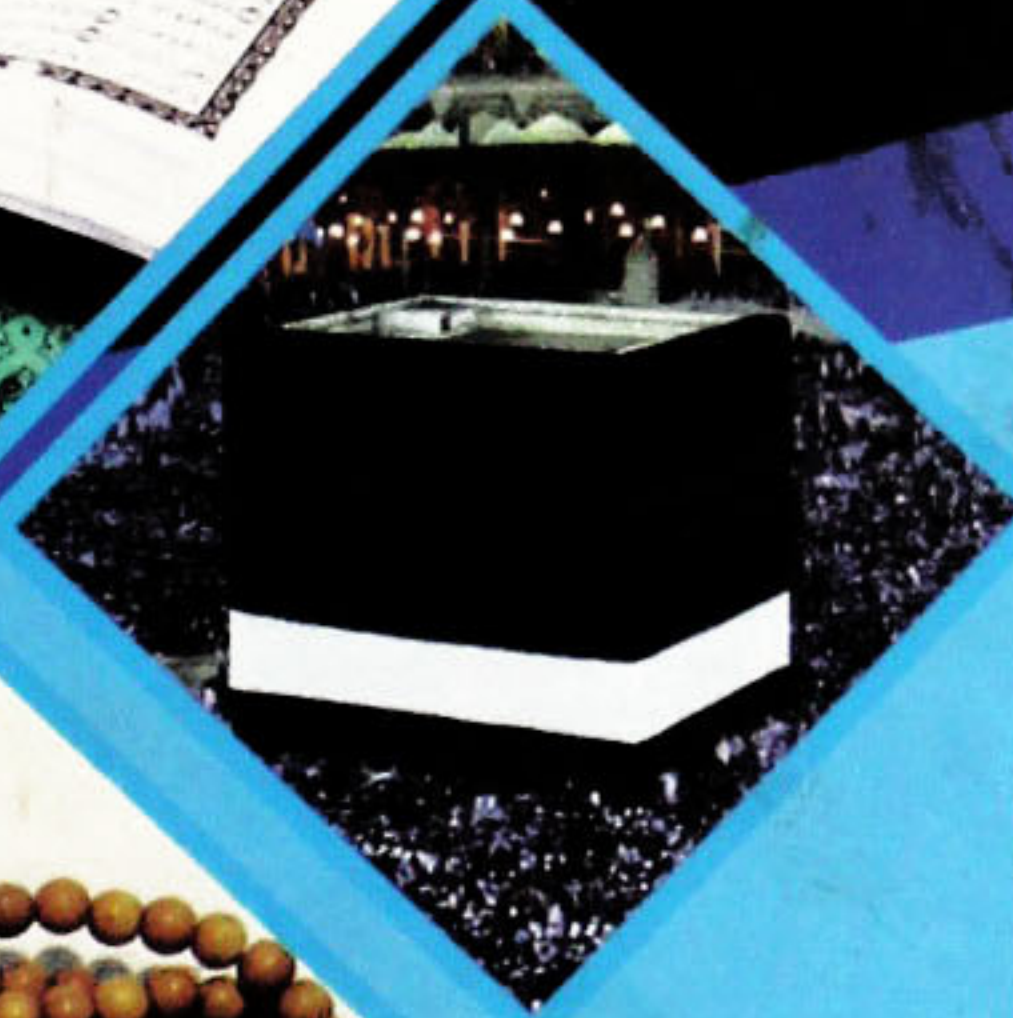


اسلام پر

علامہ محمد غزالی رحمہ اللہ



ترجمہ

ابو مسعود اظہر ندوی



اسلام کی پیروی

علامہ محمد غزالیؒ

ترجمہ

ابومسعود اظہر ندوی

مکتبہ قادیان

297

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

حج 1435

1435 94

۱۰۳۵۹۴

۲۱
نام کتاب

اسلام یہ ہے

نام مؤلف

علامہ محمد غزالی

ترجمہ

ابو مسعود اظہر ندوی

اہتمام

ملک اسد علی قاسمی

مطبع

نوید حفیظ پریس

سن اشاعت

2016

ناشر

مکتبہ قاسم العلوم

ڈسٹری بیوٹر

ملک اینڈ کمپنی

رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

042-37248209-37231119

انتساب

بہری ایجوکیشنل سوسائٹی (جگدیشپور۔ ضلع سلطانیپور۔ یوپی)

کے سربراہ

ڈاکٹر اطہر ریحان

کے نام

جو بہالت کی تاریکیوں میں علم کی شمع جلا نے کی
سعی مشکور کر رہے ہیں۔

”ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروا“

ابوسعود اطہر ندوی

فہرست ابواب

۷	عرض مترجم
۸	پیش لفظ
	۱۔ عقائد
۱۳	۱۔ اسلام کیا ہے؟
۱۷	۲۔ سب سے برتر وجود
۲۳	۳۔ توحید
۳۰	۴۔ قضا و قدر
۳۹	۵۔ انجام کار
	۶۔ یہ زندگی
۴۵	۷۔ یہ زندگی
۴۸	۸۔ خواہشات کی نہیں، عقل کی آزادی
۵۲	۹۔ مادہ و روح
۵۹	۱۰۔ مساوات

- ۶۵ -۱۰. حقوق
 ۶۹ -۱۱. اظہارِ رائے کی آزادی
 ۷۳ -۱۲. اعتقاد کی آزادی
 ۷۸ -۱۳. مفلسی سے آزادی
 ۸۸ -۱۴. خوف سے آزادی

۳۔ ایمان و عبادات

- ۹۷ -۱۵. ایمان: انسانی زندگی کی نمودِ نو
 ۱۱۲ -۱۶. عبادات
 ۱۱۸ -۱۷. عبادات کی قسمیں
 ۱۳۰ -۱۸. نماز
 ۱۳۲ -۱۹. روزہ
 ۱۴۰ -۲۰. زکاة
 ۱۴۵ -۲۱. حج
 ۱۵۱ -۲۲. بڑے اور چھوٹے گناہ

۴۔ بامقصد معاشرہ

- ۱۵۶ -۲۳. بامقصد معاشرہ
 ۱۶۶ -۲۴. مرد و عورت کی باہمی زندگی
 ۱۷۳ -۲۵. خاندان
 ۱۷۹ -۲۶. شادی آزادانہ بندھن ہے
 ۱۸۱ -۲۷. مزد گھر کا ذمے دار ہے
 ۱۸۶ -۲۸. کچھ ناگزیر باتیں

۱۹۱

۱۹۲

۲۰۳

۲۰۵

۲۱۰

۲۱۶

۲۱۹

۲۲۳

۲۲۷

۲۳۵

۲۳۶

۲۳۹

۲۴۶

۲۴۹

۲۵۰

۲۵۲

۲۵۳

۲۵۹

۲۶۶

۲۶۹

۲۸۱

۲۹۔ طلاق سے متعلق غلطیاں

۳۰۔ فرد اور قوم کے تعلقات

۳۱۔ حدود (مزائیں)

۳۲۔ چوری اور دہکتی

۳۳۔ زنا اور شہمت

۳۴۔ شراب اور منشیات

۳۵۔ ارتداد

۳۶۔ قتل اور قصاص

۳۷۔ تعزیرات

۵۔ اسلامی شریعت

۳۸۔ اسلامی شریعت

۳۹۔ شریعت کے مآخذ

۴۰۔ سنت قرآن ہی سے ماخوذ ہے

۴۱۔ اجتہاد

۴۲۔ اجماع

۴۳۔ فقہ اور معاشرہ

۴۴۔ فقہ عبادات

۴۵۔ اختلاف رائے کے اسباب

۴۶۔ معاملات

۴۷۔ شریعت کا مزاج

۴۸۔ حکم الہی کی فوقیت

۴۹۔ آخری بات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض مترجم

چالیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف علامہ محمد غزالی عالم اسلام کے ممتاز صاحبِ قلم ہیں۔ جدید اسلوب میں اسلام کی بہترین ترجمانی اور اسلام کے بارے میں پھیلانی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں ان کی شخصیت کافی شہرت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ”اسلام یہ ہے“ جو مصنف کی مایہ ناز کتاب ”ہذا دیننا“ کا ترجمہ ہے۔ ایک ایسا صاف و شفاف آئینہ ہے جس میں اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات کی سچی تصویر اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ علامہ غزالی دعوت و تصنیف کے میدان میں تقریباً نصف صدی سے سرگرم عمل ہیں اور انھوں نے گہرائی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں اور ان سے متعلق پائی جانے والی بے بنیاد خام خیالیوں اور غلط فہمیوں کا پوری بیدار مغزی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں اس مطالعہ کا پتھر، مختصر مگر جامع و واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب عقائد، عبادات، اسلامی شریعت اور ان سے متعلق متعدد ضروری ابواب پر مشتمل ہے جن کے تحت پورے دین کے اہم پہلوؤں اور گوشوں کی دلنشین انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ پوری بحث کا انحصار قرآن کریم، احادیث نبویہ نیز ائمہ و فقہائے کرام کے اقوال پر ہے جن کے ذریعہ دین سے متعلق بہت سی خام خیالیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اردو والی حضرات کے لیے بھی

استفادہ عام کا ذریعہ بنائے۔ واللہ الموفق وهو المستعان

ابوسعود اظہر ندوی

پیش لفظ

مجھ سے ایک بڑے ذمے دار نے فرمائش کی تھی کہ ایک ایسی کتاب تیار کروں جس میں عصرِ حاضر کے اسلوب کے مطابق اسلامی تعلیمات کے سارے حقائق آجائیں مگر شکل و دقتی اصطلاحوں کی بھرمار نہ ہو۔ یہ کتاب جامع ہونے کے ساتھ ساتھ مختصر مگر بالکل واضح ہونی چاہیے تاکہ اگر کوئی ایسا شخص بھی جو اسلام کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہو، اسے پڑھے تو اس کے سامنے پوری تصویر آجائے اور وہ اس دین کے بارے میں سب کچھ جان لے۔ میں نے یہ فرمائش قبول کر لی تو اسے عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچنا شروع کیا میں نے بہت سے اسلامی موضوعات پر لکھا ہے اور عام قارئین میری کتابوں سے بخوبی واقف ہیں۔ کیا اب تک جو کچھ میں نے مفصل لکھا ہے اس کی تلخیص مناسب رہے گی؟ یہ چیز مصنف کے لیے ذرا پریشان کن ہوتی ہے۔

لیکن تجویز بہر حال اس لائق تھی کہ اسے گرم جوشی سے قبول کیا جائے۔ چنانچہ میں نے اسے عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنے ذہن میں یہ بھی طے کیا کہ میں نے اب تک اسلام کے جو حقائق پیش کیے ہیں ان کا واضح خلاصہ بھی آجائے۔ اور ان سے متعلق نئے دلائل کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔ ساتھ ہی کچھ نئے ابواب بھی شامل کر دیے جائیں۔



اسلام ایک منصفانہ کا زہ ہے لیکن انسوس یہ ہے کہ اس کی بیروی ناکام دہلیوں کے

ہاتھوں میں ہے۔ اکثر جب میں اسلام کے بارے میں گفتگو کرنے والوں کی باتیں سنتا ہوں تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ چپ ہی رہتے۔ اس موضوع پر کچھ نہ بولتے۔ ان میں بیشتر دین کو سمجھتے ہی نہیں اور جو تھوڑا بہت سمجھتے ہیں اسے بھی اچھے انداز میں پیش نہیں کر پاتے۔

اور ایسا اس زمانہ میں ہو رہا ہے جب بالکل حقیر نظریات بھی لوگوں کے سامنے خوب بنا سنوار کر پیش کیے جا رہے ہیں جسے بد صورت عورت طرح طرح کے میک اپ اور زیورات و طبوسات میں اپنے آپ کو چھپا لیتی ہے۔

لوگ فطری طور پر جس چیز کے بارے میں جانتے نہیں اس کے مخالف ہوتے ہیں۔ اب اندازہ کیجیے کہ جب مسلمان اپنے دین کو بے کم و کاست واضح اور بہترین انداز میں نہیں پیش کرتے اور حق کو صاف شفاف صورت میں سامنے نہیں لاتے تو وہ اس کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں؟

حق اگر واضح اور روشن ہو جائے تو دیدہ و دل کو خود بخود اپنی طرف کھینچتا ہے۔ آج کے لوگ اسلام کو بہترین انداز میں سمجھنے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت مند ہیں قدیم کتابیں اپنے زمانے میں یقیناً مفید رہی ہوں گی اور اپنے دور کے لوگوں کے مسائل کو انہوں نے سلجھایا ہو گا لیکن اب وہ دور ختم ہو چکا اور اس کے ساتھ ہی وہ روحانی و مادی مسائل بھی بدل چکے

آج سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ دین کو اس طرح جان سکیں جس سے ان کا نفسیاتی خلا پُر ہو اور وہ شکوک و شبہات دور ہو جائیں جو استعمار کے حملے کے بعد سے الحاد و اباحت کے دلال پیدا کرتے رہے ہیں۔



اگر چوتھی صدی ہجری کے آخر میں یہ ضرورت پیدا ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کے لیے احیاء علوم الدین (مصنفہ امام غزالیؒ) جیسی کتاب لکھی جاتے تو ہمیں اس سے بھرتی حاصل کرنی چاہیے۔ دینی معارف بھی زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اور خواہشات نفس اور لہو و لعب

کے غلبہ کے ساتھ گرد آلود نظر آنے لگتے ہیں اور یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ گرد و غبار سے صاف کر کے پھر سے انہیں زندہ کیا جائے۔

یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دائمی ورثہ کے ساتھ دنیا کے سامنے آئیں ان کے پاس ایسی کتاب ہے جو کبھی پرانی اور فرسودہ نہیں ہو سکتی۔

ان کے پاس اپنے نبیؐ کی صاف شفاف بیعت ہے۔

روشنی کی ان تیز کرنوں کے ساتھ ہم کیسے راستہ بھٹک سکتے ہیں اور اندھیروں میں گم

ہو سکتے ہیں؟

آجکل دینی تعلیم کی کوتاہی یہ ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچانے والی بصیرت پیدا نہیں کر پارہی ہے اور اس سلسلے میں اسی طرح عاجز و درماندہ ہے جیسے پھولوں سے لہکے ہوئے چمن میں بھی وہ شخص بہترین خوشبوؤں سے لطف اندوز نہیں ہو پاتا جسے زکام ہوا ہو۔ اس کتاب میں ہم نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ نگاہوں کے سامنے سے پر وہ ہٹانے کی کوشش کریں تاکہ حقیقت اپنے اصلی روپ میں نظر آسکے۔ اس میں ہم نے اپنی طرف سے کوئی چیز داخل نہیں کی ہے بلکہ خالص حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے کلام کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔

واللہ ولی التوفیق

محمد غزالی

عقائد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسلام کیا ہے؟

یہ نیا نام، جسے چودہ صدیوں سے لوگ سنتے آرہے ہیں اُس قدیم حقیقت کا عنوان ہے جس کا آغاز مخلوق کے وجود کے ساتھ ہی ہوا تھا اور جو انسانی زندگی کے دوش بدوش چلتی رہی ہے اور ان تمام رسالتوں کے ساتھ اس کا سلسلہ جڑا رہا ہے جنہوں نے انسانوں کا تعلق ان کے عظیم پروردگار سے جوڑا اور انہیں اس بات سے آگاہ کیا کہ اللہ ان سے کیا چاہتا ہے۔

لیکن یہ بات ذرا تشریح چاہتی ہے۔

یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ یہ ایک قدیم حقیقت ہے؟

جواب یہ ہے کہ: یہی اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان تعلق کا بنیادی عنصر ہے جس کی تصویر کشی سارے مذاہب کرتے رہے ہیں اور سارے ہی رسول ہیں پیغام پہنچاتے رہے ہیں۔

وہ تمام رسول جو پہلے زمانوں میں نمودار ہوئے رہے ہیں اور جن پر مختلف نسلیں ایمان لاتی رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضرت موسیٰ سے یا حضرت عیسیٰ سے یا حضرت محمدؐ وغیرہ سے فرمایا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اسی طرح اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے جو کچھ ان پیغمبروں نے اپنے متبعین کو بتایا یا جو کچھ ان دوسرے پیغمبروں نے بتایا جن میں کچھ کے نام ہم جان سکتے ہیں اور کچھ

کے نام نہیں جان سکے، دین ان سب کے نزدیک اپنے ارکان اور اپنے نفاذ کے اعتبار سے ایک ہی ہے اور اس ہمہ گیر دینی وحدت پر قرآن کریم نے متعدد مواقع پر زور بھی دیا ہے، اور یہ اصول بھی بیان فرمایا ہے کہ سارے انبیاء ایک مشترکہ عمل میں بھائی بھائی ہیں اور نہ ان کی بیروی میں فرق کرنا جائز ہے نہ ہی پیغمبروں میں ایک دوسرے کے درمیان امتیاز کرنا۔

تمہارے لیے دین میں راہ ڈال دی وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو کیا یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔

نَشْرَعُ لَكُمْ مِنْ الدِّينِ مَا وَصَّيْنَا بِهِ نُوْحًا وَالدِّيْنِ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوسٰى وَعِيسٰى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَفْرَقُوْا

فِيْهِ - (الشوری - ۱۳)

کہہ دو ہم ایمان لائے الستر پر اور جو کچھ اترا ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیم واسماعیل واسحاق و یعقوب اور ان کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ اور عیسیٰ اور سب نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے۔ ہم ان میں کسی کو جدا نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنزِلَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبٰطِ وَمَا اَوْتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَالتَّيْسُوْتِ مِنْ رَبِّهِمْ لَافْتَرَقَ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَكُمْ مُسْلِمُوْنَ - (آل عمران ۸۴)

○
زمانہ و مکان کے اختلاف سے بے نیاز اس ہمہ گیر وحدت کی بنیاد ہے فطرت۔
جی ہاں۔ فطرت سلیمہ ہی اللہ کا دین ہے۔

اور فطرت انسان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بس قلب سلیم اور فکر سلیم کا نام ہے۔
موجودہ زندگی اور ابدی زندگی کے لیے انسان کی صلاحیت بغیر اس سلامت قلبی و فکری کے پوری نہیں ہو سکتی۔

بسا اوقات ایسے افراد ملتے ہیں جو دین سے نسبت رکھتے ہیں اور اس کے مراسم و

مظاہر ان پر نمایاں نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل اور ان کے خیالات مریض ہوتے ہیں یقین رکھیے کہ یہ لوگ دین سے اسی قدر دُور ہوتے ہیں جس قدر ان کے دلوں اور خیالوں میں کجی اور بے راہ روی ہوتی ہے۔

اگر کسی گھر پر بہترین رنگ و روغن کر دیا جائے جبکہ اس کے دیواریں گر رہی ہوں تو اس گھر کو صحیح حالت میں نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اسی طرح اگر کسی انسان کی قلبی و ذہنی حالت کو خواہشات اور اوہام و خرافات نے بگاڑ رکھا ہو تو اسے ہم دیندار نہیں کہہ سکتے۔ حقیقی دینداری کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ قلبی و ذہنی حالت بالکل صحیح اور ہر بگاڑ سے دُور ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سو تم ایک طرف کے ہو کر اپنا منہ دین پر سیدھا رکھو۔ وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کے بنائے ہوئے میں تبدیلی نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

فَاتِمٌ وَجْهًا لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ
اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا
تُبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ
الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

(الروم - ۳۰)



اسلام جو تعلیمات لے کر آیا ان کا مقصد یہی ہے کہ فطرت کو ان اجنبی جراثیم سے محفوظ رکھا جائے جو برابر اس پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں جیسے انسان اس لیے غذا میں اور دوائی استعمال نہیں کرتا کہ ان سے کوئی نیا جسم پیدا ہوگا یا وہ کوئی دوسری مخلوق بن جائے گا۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کا اصل وجود اسی طرح باقی رہے اور نشوونما پاتا رہے جیسے اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ فطرت والی آیت کے بعد ہی فطرت کی حفاظت کرنے والی آیت نازل فرماتا ہے:

سب اس کی طرف رجوع ہو کر اس سے ڈرتے رہو اور نماز قائم رکھو اور شرک کرنے والوں

مَنْبِئِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ

فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا كُلَّ حِزْبٍ
بِمَالِدِيهِمْ فَرِحُونَ (الروم ۲۱-۳۲)

میں نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین میں بھپوٹ
ڈالی اور ان میں بہت فرقے ہو گئے۔ ہر
فرقہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔

فطرت کے تعلق سے دین کی تعلیمات کی وہی حیثیت ہے جو عقل کے تعلق سے
زندگی و کائنات سے متعلق علوم کی۔

جس طرح انسانی فکر ان علوم کے ذریعہ اپنے دائرے وسیع کرتی ہے اور اپنے
احکام کی تصدیق کرتی ہے۔ اسی طرح فطرت، دین کی تعلیمات کے ذریعہ صفائی و ہم آہنگی
حاصل کرتی ہے اور سیدھا راستہ پہنچاتی ہے۔

اسی لیے ان ذمے داریوں کو نبھانا ناگزیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی سلامت و
کی ضمانت کے لیے مقرر فرمائی ہیں۔

اور جو کوئی اپنا منہ اللہ کی طرف تابع کرے
اور ہو وہ نیکی پر، سو اس نے مضبوط کڑا پکڑ
لیا اور ہر کام کا انجام اللہ ہی کی طرف ہے۔
اور اس سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے اللہ
کے حکم پر پیشانی رکھی اور نیک کاموں میں
لگا ہوا ہے اور چلا دین ابراہیم پر جو ایک
طرف کا تھا۔

وَمَنْ يُسَلِّمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ
وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
الْوُثْقَىٰ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (لقمان ۲۲)
وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ
لِللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ
إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔
(النساء۔ ۱۲۵)

آپ نے دیکھا؟

قرآن کریم دین کے تعلق سے فطرت کی اصل سابقہ رسالتوں کی طرف منسوب کرنا
حضرت محمدؐ تعمیر کے لیے تشریف لائے تھے مہندم کرنے کے لیے نہیں۔

آپ اپنے سے پہلے کے رسولوں کی مخالفت کے لیے نہیں ان کی تائید و تصدیق
کے لیے تشریف لائے تھے اور آپ کا دین اسلام اسی روشن انسانی فطرت کی علم برداری
و نمائندگی کرتا ہے جس کے ذریعہ ہی اس کو سر بلندی حاصل ہو سکتی ہے۔

سب سے بڑا وجود

اسلام ————— واضح طور پر ————— اللہ تعالیٰ کے وجود کی تصدیق کی بنیاد پر قائم ہے اور اسی پر ایمان اس کے سارے قوانین کا محور ہے۔
قرآن کریم میں ایسی دسیوں دلیلیں بیان فرمائی گئی ہیں جو عقل و ضمیر میں اس حقیقت کو جاگزیں کرتی ہیں اور مسلمان اس کے پورے شعور و احساس کے دائرے میں زندگی گزارتا ہے۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک سائنس دان لکھتے ہیں:
چار ہی احتمالات ہو سکتے ہیں۔

۱۔ وجود تمام تر وہم ہو، چاہے وہ ہماری محسوس دنیا سے تعلق رکھتا ہو یا ہماری آنکھوں سے اوجھل ماورائی دنیا سے۔ مثلاً ہم جس زمین پر چلتے ہیں یا جن گاڑیوں پر سوار ہوتے ہیں وہ سب محض خیالی ہوں۔ قدیم و جدید فلاسفہ کے یہاں اس احتمال کا ذکر ملتا ہے۔

لیکن یہ احتمال اس قدر بے وزن ہے کہ اس سے صرف نظر ہی کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ یہ کہ دنیا ایک حقیقت ہے جو عدم سے خود بخود وجود میں آگئی اور اس میں کسی بیرونی محرک کا کوئی دخل نہیں۔

یہ احتمال بھی پہلے احتمال سے کم بے وزن نہیں۔

اور اس کو ماننے کا مطلب ہوگا اسباب اور مسببات کے قانون کو کالعدم قرار دینا اور ان تمام بنیادوں کو مسمار کر دینا جن پر علم و سائنس کا دار و مدار اور جن کے ساتھ زندگی رواں دواں ہے۔

۳۔ یہ کہ دنیا قدیم مادہ ہے (دنیا کی قدامت کا قول محض گمان ہے جس کی کوئی دلیل نہیں تسلیم شدہ بات یہ ہے کہ مادہ تو انائی ہیں بدلتا رہتا ہے) اس کے وجود کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ اسی سے ایسے طویل مراحل کے ساتھ جن کی تشریح دشوار ہے، مختلف قسم کی مخلوقیں نمودار ہوتی ہیں یہ احتمال کائنات کو کسی کارساز کا کارنامہ اور خود سے ہو جانے والی چیز دونوں بیک وقت بناتا ہے۔ مثلاً ایک شاندار عمارت کو دیکھا جائے پھر اس کی تعمیر میں جو کچھ مہارت اور ندرت نظر آئے اسے کسی انجینئر کی طرف منسوب کرنے کے بجائے مٹی، چھت اور کھڑکیوں کی طرف منسوب کر دیا جائے۔

یہ احتمال ایک نہ ختم ہونے والے کمال کا تصور پیدا کرتا ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس میں بہترین حکمت اور ہمہ گیر علم کی کار فرمائی بھی ہے لیکن یہ ساری صفات منسوب کر دی جائیں مثلاً اس مٹی کی طرف جسے ہم پاؤں تلے روندتے ہیں یا اس ہوا کی طرف جسے ہم سانس کے ذریعہ کھینچتے ہیں اور یہ کہا جائے کہ وہ پیدا بھی کرتی ہیں اور فنا بھی کرتی ہیں!!!

انسانی عقل جب یہ یقین رکھتی ہے کہ پودوں کے اگنے کے لیے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ کچھ متعین صورتوں کا پایا جانا ضروری ہے اور قدرت و مشیت کی یہ صورتیں مٹی اور پانی کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتیں۔ بلکہ ان دونوں کے علاوہ کسی وجود کی طرف نسبت بدیہی معلوم ہوتی ہے۔ تو اب چوتھا احتمال ہی باقی رہتا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کا وجود۔ اور یہ عقلی احتمال ہی تخلیق کے قصہ کی واحد صحیح تشریح ہے یا دوسرے الفاظ میں قبول و احترام کے سب سے زیادہ لائق ہے۔

یہ کتنی بے وزن بات ہوگی کہ آپ مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کریں کہ ماں کے پیٹ میں جنین ماں کی نگرانی میں یا باپ کی مدد سے یا پیٹ اور سینے کے درمیان مختلف آلات کی مدد سے نشوونما پاتا ہے اور ان میں سے کوئی جنین کی آنکھ بناتا ہے کوئی کان وغیرہ وغیرہ۔
نہیں نہیں

بس اتنا کہہ دو کہ اللہ۔ پھر انھیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لیے چھوڑ دو۔

قُلِ اللّٰهُ شَمَّ ذَرْهَمٌ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔

(الانعام - ۹۱)

وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا زبردست اور رحیم۔ جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی پھر اس کی نسل ایسے ست سے چلائی جو حقیق پانی کی طرح ہے پھر اس کو نیک ملک درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے آنکھیں دیں اور دل دیے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔

ذٰلِكَ عَلِيْمٌ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ الَّذِيْ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهِ وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔

(السجدہ ۵-۶-۹)

قرآن کریم میں کثرت سے ایسی دلیلیں بیان کی گئی ہیں جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کی طرف لے جاتی ہیں۔

یہ دلیلیں انتہائی لطیف اور دل کے تاروں کو چھونے والی ہیں اور ان سب کا مقصد انسانی فکر کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ اپنے ارد گرد پر نگاہ ڈالے اور اس کی نشانیوں پر غور کرے۔

اور انسان اس نگاہ اور اس غور و فکر کے بعد یقیناً اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے گا۔
 وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ
 وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ -
 (الذاریات - ۲۰ - ۲۱) وجود میں ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ فارس کا فرماں روا کمرنی نوشیرواں ایک رات لیٹا تو
 اس کی نگاہیں افق میں دور دور تک چکر لگانے لگیں تب وہ کہنے لگا:

”اے آسمان! تو جس عمارت کی چھت ہے بلاشبہ وہ عظیم ہے۔

تو جس گھر کو ڈھانکے ہوئے ہے، بلاشبہ وہ عظیم ہے۔

تو جس چیز پر سایہ مگن ہے وہ یقیناً بہت بڑی ہے۔

اور تعجب کرنے والوں کے لیے تجھ میں بہت سی تعجب خیز چیزیں ہیں
 کاش میں جان سکتا کہ: کیا ترے نیچے ستون ہیں جنہوں نے تجھے تھام
 رکھا ہے یا ترے اوپر کچھ مضبوط کھونٹیاں ہیں جن کے سہارے تو لٹکا ہوا
 ہے، بلاشبہ جس بادشاہ کی قدرت نے تجھے تھام رکھا ہے وہ یقیناً عظیم
 قدرت والا ہے اور وہ اپنے اندازے کے مطابق تجھے گول دائرے
 میں ڈھالنے میں یقیناً بڑی حکمت و باخبری سے کام لینے والا ہے۔
 اور جو اس عظمت پر غور کرنے سے غافل رہ جائے وہ یقیناً کوتاہ ذہن
 اور غبی ہے۔

اے آسمان! کاش میں جان سکتا کہ تو کس طرف سے طلوع ہوتا ہے؟

کس طرح اپنی مسافت طے کرتا ہے؟

کس طرح ڈوبتا ہے؟

اور ڈوبنے کے بعد کہاں جا کرتا ہے؟

کاش میں جان سکتا کہ: تو ساکن ہے یا متحرک؟

تیری صفت خاص کیا ہے؟

تیرا رنگ کیا ہے؟

تو جن ناموں سے پہچانا جاتا ہے وہ نام کس نے رکھے ہیں؟
پاک ہے وہ ذات تو جس کے حکم کی بجا آوری کر رہا ہے اور جس کی مشیت و مرضی
سے تو رواں دواں ہے۔

اور جس کی کارِ سنجری کی بدولت تو کھرا ہوتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔
رات کے بکراں اندھیروں کے مہیب سناٹے پر غور کیجئے، پھر آسمان میں بھرے
ہوئے مسکراتے تاروں پر نگاہ ڈالیے آپ کو محسوس ہوگا کہ تاریکی کے ان دبیز پردوں
کو چیرتی ہوئی کوئی دلنواز نوراتی آواز آپ کے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ رہی ہے
ٹھنڈک اور سکون سے بھر پور روشنی کی کرنیں آہستہ آہستہ آپ کے دل کو منور
کرتی جا رہی ہیں اور ایک لطیف احساس سے سرشار ہو کر آپ کا دل ایک اذلی نغمہ
گنگنانے لگا ہے۔

”بے شک تو ہی اللہ ہے“

آپ ایک اٹھارہ سمندر کے کنارے کھڑے ہیں تاحدنگاہ پانی ہی پانی ہے
اور ایسا لگتا ہے کہ نگاہ کی حدیں جہاں ختم ہوتی ہیں وہاں نیلگوں آسمان نیلگوں
پانی سے مل رہا ہے صبح کو اسی نیلگوں سنگم پر سورج آہستہ آہستہ اپنی کرنیں پھیلاتا
ہوا نظر آئے گا اور شام کو اپنی کرنیں سیٹھا ہوا رنگ برنگی شفق بکھرتا ہوا اور گنگنانا
ہوا جیسے جنت سے کسی بلبلی خوش نوا کے دلنواز نغمے کی صدا آرہی ہو۔

عظمت سے بھر پور سمندر کی ان جلوہ آرائیوں کو دیکھ کر آپ بے ساختہ اس
کے خالق و مدبر کی عظمت کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور آپ کا دل پکارا اٹھے گا۔
”بے شک تو ہی اللہ ہے“

آپ ایک سمندری جہاز میں ہیں۔ ساحلِ بنگا ہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔
جدھر نگاہ اٹھتی ہے سمندر کی بے کراں وسعتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اچانک ہوا تیز ہوتے
لگتی ہے بادل گر جنے لگتے ہیں، بجلیاں چمکنے اور کڑکنے لگتی ہیں۔ اندھیرا گہرا ہوتا

چلا جاتا ہے۔ بڑھتے ہوئے طوفان کی موجیں جہاز کو کھلونا بنا کر کھیلنے لگتی ہیں، ناخدا پریشان و ششدر ہو گئے ہیں۔ جہاز کسی طرح ان کے قابو میں نہیں آرہا ہے۔ ہر طرف سے موت کے خونخوار پنجے بڑھتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔ آپ کا دل اپنے پروردگار سے آہ و فریاد کر رہا ہے۔ اچانک طوفان ٹھمنے لگتا ہے اور نجات کی امید جہاں فرزا اپنا روتے زیبا دکھانے لگتی ہے۔ آپ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔

”بے شک تو ہی اللہ ہے“

آپ سخت بیماری میں پڑے ہیں۔ ڈاکٹروں کی ساری ترکیبیں ناکام ہو چکی ہیں چارہ گر مایوس ہو چکے ہیں۔ تیمار دار عزیز و قریب زبانِ حال کے آنے والی سنگین حقیقت کی ترجمانی کر رہے ہیں، مخلصین آہ و زاری کے ساتھ دعاؤں میں مصروف ہیں۔ دنیا داغِ مفارقت دے رہی ہے، دولت بیکار ہو چکی ہے، جاہ و منزلت سرابِ ثابت ہو چکے ہیں، آرزوئیں دم توڑ چکی ہیں، دل کی خواہشیں باطل ہو چکی ہیں۔ دنیا کے ہر بندھن کو توڑ کر آپ اپنے پروردگار کی طرف دل لگاتے ہیں، اچانک رحمتِ حق جوش میں آتی ہے اور مایوسی امید سے بدل جاتی ہے۔ آپ کا دل بول اٹھتا ہے:

”بے شک تو ہی اللہ ہے“

آپ کی نگاہ کبھی ناشگفتہ کلیوں پر پڑتی ہے کبھی مسکراتے ہوئے پھولوں پر آپ ان کے حسن سے مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں، کبھی طائرانِ خوشنوا کے نغمے آپ کا دامنِ دل کھینچ لیتے ہیں اور دل خوشی و انبساط سے بھر جاتا ہے۔ ایسی جانفز اچیزیں کون پیدا کر سکتا ہے۔

کائنات میں عظمت کے مناظر دیکھیے، رحمت کے مناظر دیکھیے، جمال و جلال کے مظاہر دیکھیے، دوام و بقا کے مناظر دیکھیے، قدرت و قضا کے مناظر دیکھیے، آپ کے دل کے تاروں سے بے ساختہ یہی نغمہ نکلے گا۔

”بے شک تو ہی اللہ ہے“

۱۲۳۵۹۲

توحید

لوگ قدیم زمانوں میں بھی کئی معبودوں کے شوق میں مبتلا رہے ہیں اور آج کے دور میں بھی کئی معبودوں کا تصور ایسی خرافات ہے جس کی اسلام نے پوری توثیق سے مخالفت کی ہے اور لوگوں کے ایک ایک وہم کے تار و پود بکھرے ہیں تاکہ اس سلسلے میں شہرت کو دور کیا جائے اور تاریکیوں کے پردے چاک کر دیے جائیں۔ اور اس میں کچھ تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ عقیدہ و عمل کے میدان میں مطلقاً توحیدی اسلام کی پہلی علامت اور نعرہ ہے۔ یہی اس کی پہچان بھی ہے اور اسی کی وجہ سے اس کی مخالفت پر کمر بھی باندھی گئی ہے۔

اس موضوع پر لمبی بحث چل چکی ہے جس کا ذکر قرآن نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔

کیا تم کو اہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور
معبود بھی ہیں۔ کہہ دو میں تو کو اہی نہ دوں
گا۔ کہہ دو وہی ایک معبود ہے اور میں
تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔

أَنْتُمْ لَنْ تَشْهَدُوا أَنَّ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا
أُخْرَى قُلْ لَا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا
هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ وَإِنِّي بَشَرٌ
مِمَّا تَشْرِكُونَ۔

الانعام — ۱۶

اور اللہ نے کہا ہے دو معبود مت پکرو۔
وہ معبود ایک ہی ہے سو مجھ سے

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَهَيْنِ
إِثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ فَإِنِّي

ڈرو۔

فَارْهَبُونِ - (النحل - ۵)

بے شک تم سب کا حاکم ایک ہے۔
آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ اس
کے بیچ میں ہے اور مشرقوں کا رب۔
اور تم سب کا ایک ہی معبود ہے اس
کے سوا کوئی معبود نہیں بڑا مہربان نہایت
رحم والا ہے۔

إِنَّ إِلَهَكُمْ لَوَاحِدٌ
رَّبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا
وَرَبُّ الشَّارِقِ - (الصفات ۲ - ۵)
وَإِلَهُكُمْ إِلَهٌُ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا
هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ

(البقرہ - ۱۶۳)

یہی واحد پروردگار لوگوں کا ولی و نگران ہے۔ نہ اس کے علاوہ کسی دوسرے
کی ولایت سے وابستگی اختیار کرنا جائز ہے اور نہ صرف اس کے علاوہ کسی اور سے
لوگ کانا۔

کیا انہوں نے اس کے سوا کام بنانے
والے پکڑے ہیں سو اللہ وہی ہے جو کام
بنانے والا ہے اور مردوں کو جلاتا ہے
اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے۔

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ
فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي
الْمَوْتَى وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ

(الشوریٰ - ۴)

اسی پر چلو جو تم پر اترا تمہارے رب کی
طرف سے اور اس کے سوا رفیقوں کے
پچھنے نہ چلو تم بہت کم و میاں کرتے ہو۔

اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُمْ مِنَ رَبِّكُمْ
وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا
مَّا تَذَكَّرُونَ

(الاعراف - ۳)

وہی لوگوں کی شفا عت کرنے والا، ان کی لغزشوں سے درگزر کرنے والا
اور مشکلات و مصائب میں ان کا ملجا و ماوی ہے کوئی دوسرا اس کا سا جی نہیں۔
کیا انہوں نے اللہ کے سوا کوئی سفارش
والے پکڑے ہیں کہو اگرچہ ان کو اختیار

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ
شُفَعَاءَ قُلُوبًا لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

نہ ہو کسی چیز کا اور نہ سمجھ کہہوا اللہ کے اختیار
میں ساری سفارش ہے آسمان اور زمین
میں اسی کا راج ہے۔

شَيْئًا وَلَا يَعْزِلُونَ فَمَنْ لِلَّهِ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ -

(الزمر ۲۳-۲۴)

اور اس توحید کی بنیادیں — جیسا کہ اسلام نے واضح طور پر بتایا ہے —

اس طرح ہیں:

کیا یہ تمام عالم ایک ہی خالق کا نہیں ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو اس
کی نگرانی کرتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ وہ آسمان اور سیارے جنہیں ہم دُور سے دیکھتے ہیں، وہ زمین
جسے ہم قریب سے پہچانتے ہیں، نباتات، حیوانات اور مٹی و پانی جیسے جمادات وغیرہ
ان سب کی تنظیم میں ایک ہی چھاپ نظر آتی ہے اور سب ایک ہی قانون کی پیروی
کرتے ہیں۔

اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی ایک خدا نے بعض براعظموں کو پیدا کیا ہے
اور کسی دوسرے خدا نے بقیہ براعظموں کو۔ یا یہ کہ ایک خدا نے زمین پیدا کی دوسرے
خدا نے چاند۔ کیونکہ اس طرح کا خیال خود بخود ساقط ہو جاتا ہے۔

کیا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک
ٹھہرائے ہیں انھوں نے کچھ پیدا کیا ہے
جیسا کہ اللہ نے پیدا کیا پھر ان کی نظر میں
پیدائش مشتبہ ہو گئی کہہوا اللہ ہر چیز کا پیدا
کرنے والا ہے اور وہی اکیلے ہر دست

أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا
كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ
فَلْيَهُمُ فَمَنْ أَلَّهِ خَالِقُ كُلِّ
شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ -

(الرعد: ۱۶)

سچہ
کہہو مجھ کو دکھلاؤ تو میں جہنم کو آسمان
تسبیح سناؤ گی تمہارے دوسرے کون سا اللہ ہے کہ وہ

فَمَنْ أَلَّهِ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ
الْقَهَّارُ -

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔
 نہیں، وہی اللہ زبردست حکمتوں
 (سیا۔ ۴۷) والا ہے۔

زمین کو سورج سے ایک خاص دوری پر رکھنا ہی زندہ وجودوں کے وجود
 و بقا کا موقع فراہم کرتا ہے کیونکہ ان کے جسموں کی ہستی، ان کے حواس کی کارکردگی،
 کھیتوں کی افزائش اور اس ہوا کی لطافت جس میں وہ سانس لے رہے ہیں۔ یہ
 سب اسی پر موقوف ہے اور اسی سے مربوط ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کے خود اپنی جگہ چکر لگانے اور سورج کے ارد گرد
 چکر لگانے، سورج کے فضلے کے بیٹھنے میں تیرنے اور سیاروں کے ایک خاص
 نظام کے مطابق گردش کرنے میں ایک متعین نظام کی کارفرمائی ہے اور ان سب
 کی دیکھ بھال ایک ہی ارادہ و مشیت کے ذمے ہے اور ان سب کی ترتیب و
 تنظیم اور ہم آہنگی ایک حکمت کی نشاندہی کرتی ہے یعنی یہ کہ ان سب کا ایک ہی
 پروردگار ہے جس کا کوئی ساتھی نہیں۔

پھر کیا کسی اور نے کبھی اس کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ
 الوہیت میں شریک ہے اور تخلیق، رزق رسانی، عدم سے وجود میں لانے، وجود
 سے عدم میں پہنچانے اور اس وسیع کائنات میں زندگی کے معاملات کی تنظیم و تدبیر
 میں حصہ بٹا رہا ہے؟

آج تک کسی نے اس کی جرأت نہیں کی۔

شُرک کی ساری کہانی بس اتنی ہے کہ کچھ ناواقف لوگوں نے کسی پتھر کو مقدس
 قرار دے لیا یا بعض نیک لوگوں کو مقدس بنا لیا اور ان کی طرف وہ صفات منسوب
 کر دیں جنہیں وہ نہیں چاہتے تھے اور نہ کسی کو اس کی اجازت ہی دے سکتے تھے
 کہ ان صفات کو ان کی طرف منسوب کریں۔

یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا بعض کم فہم لوگوں کے ذہنوں کی
 خیال آرائی سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقیقت سے اس کا کچھ بھی تعلق نہیں جیسے کوئی

یہ سمجھنے لگے کہ مثلاً امریکا میں دو صدر تہو رہتے ہوتے ہیں جو فرمان جاری کرتے ہیں اور ملک کی سیاست چلاتے ہیں۔ یا مثلاً انگلینڈ میں دو بادشاہ حکومت کر رہے ہیں۔ چونکہ مشرکین توحید کی حقیقت کسی قدر محسوس کرتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ انہوں نے خدا کے جو شریک گھڑے ہیں وہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ اس لیے انہوں نے ان نام نہاد معبودوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک طرح کا تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی کہ شاید اسی تعلق سے ان کے معبودوں کو کچھ حیثیت حاصل ہو جائے۔

چنانچہ انہوں نے ان معبودوں کو اللہ تعالیٰ کی اولاد (وغیرہ) قرار دیا۔

قرآن کریم نے اس بہتان کی صاف صاف تردید فرمائی۔

وہ اپنا بنایا ہوا جھوٹ کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہوئی اور وہ بے شک جھوٹے ہیں۔

الَا إِنَّهُمْ مِنْ أَفْئِدَتِنَا لَمِثْرٌ
وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ۔

(الصافات ۱۵۱ - ۱۵۲)

اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو بے لگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ إِذْ أَذَىٰ ذَهَبَ كُلَّ إِلَهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَّ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ۔

(المؤمنون ۹۱)

لوگوں نے کہہ دیا اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی ملک ہے تمہارے پاس اس قول کے لیے آخردلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ مَوْلَاً أَسْبِحَانَهُ هُوَ الْغَنِيُّ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ إِنَّ عِنْدَ كُفْمٍ مِنْ سُلْطَانٍ بِهَذَا أَتَقُولُونَ عَلَىٰ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ

يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ
لَا يَفْلِحُونَ -

رویس ۶۸ - ۶۹

کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم
میں نہیں ہیں۔ اے نبی! کہہ دو کہ جو
لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں
وہ ہرگز فلاح نہیں پاسکتے۔

اس طرح کی خام خیالیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اسلام نے یہ واضح
کر دیا کہ نہ یہ ممکن ہے کہ اللہ سے پہلے کوئی معبود رہا ہو نہ ہی ممکن ہے کہ اس کی
ذات سے کوئی معبود نکلے۔ نہ اس کا کوئی باپ ہے نہ بیٹا، نہ اس کے یہاں کسی ماں
کی جگہ ہے نہ بیوی کی۔ اس کی ذات کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ اس کی پیدا کردہ مخلوق
ہے اور اسی کی محتاج ہے۔

وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے
اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی
اس کی شریک زندگی ہی نہیں ہے
اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر
چیز کا علم رکھتا ہے یہ ہے اللہ تمہارا
رب، کوئی خدا اس کے علاوہ نہیں ہے۔
ہر چیز کا خالق، لہذا تم اسی کی بندگی
کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔

بَدِئِمْ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنَّى
يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ
صَاحِبَةً وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ذَالِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ
لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ
وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ -

انعام ۱۰۱ - ۱۰۲

سبھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، مختلف طرح کے اعزاز
و اکرام سے نوازتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی نیک شخص یا جماعت کو اپنی طرف منسوب
کرتا ہے تو یہ نسبت حقیقی رشتے والی نسبت نہیں ہوتی کیونکہ ایسا بالکل ناممکن ہے۔
اگر اللہ کسی کو بیٹا بنا چاہتا تو اپنی مخلوق
میں سے جس کو چاہتا برگزیدہ کر لیتا
پاک ہے وہ اس سے کہ کوئی اس کا

لَوْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا
لَا حُطْفَىٰ بِهِ مَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ
سُبْحَانَهُ هُوَ اللَّهُ الْوَاحِدُ

بیٹا ہو) وہ شربے اکیلا اور سب پر غالب

(الزمر-۴)

تَنْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ صَمَدٌ
لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ
يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ
(الاحصاۃ ۱-۴)

کہو وہ شربے بچتا۔ شربے سے
بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج
ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اور نہ
وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر
نہیں ہے۔

عقیدہ میں توحید کے ساتھ ہی عمل میں توحید کا نمبر آجاتا ہے مسلمان کے
لیے واجب ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے محبت کرے اسی پر انحصار کرے اور
اسی کے لیے اخلاص پیدا کرے۔

اس کے دل کے دھڑکنوں اور ضمیر کے احساسات کا رخ اسی کی طرف ہو کسی
اور کی طرف وہ ذرا سا بھی رخ نہ کرے۔

مسلمان صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا۔
اس کے سوا کسی کی فرماں برداری نہیں کرتا نہ کسی کا حکم برپا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے
جو کچھ حلال قرار دیا ہے اسے حلال سمجھتا ہے اور جو کچھ حرام قرار دیا ہے اسے حرام مانتا
ہے۔ جو کچھ اسے ہدایت کی گئی ہے اسی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اور جہاں روک دیا
گیا ہے وہیں رک جاتا ہے۔ مسلمان سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے سامنے سر نہیں
جھکاتا، اس کے ماسوا ہر چیز کے سامنے سیدھا کھڑا رہتا ہے۔

اپنے واحد خالق کی عظمت اور کائنات اور انسانوں پر اس کے مکمل غلبہ و اقتدار
کی پہچان اس کے دل میں ترغیب و خوف کے احساسات کو صحیح سلامت رکھتی ہے۔ وہ
زیر نشان و پر آگندہ خیال ہوتا ہے نہ انحراف اور کج روی میں مبتلا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دل میں عقیدہ توحید کا جاگزیں ہونا قوت و عزت کے تمام اوصاف
کی بنیاد بن جاتا ہے اور سچا مومن کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔

قضا و قدر

بہت سے لوگوں کے نزدیک قضا و قدر مبہم بلکہ پریشان کن الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ الفاظ ایسے لطیف مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے اور ذہن کو اطمینان حاصل ہو جائے۔ کیا آپ کو اس میں کچھ شک ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز جانتا ہے؟ کیا جب اطمینان بخش دلیلوں کی بنیاد پر آپ کو یہ یقین حاصل ہو چکا کہ وہ ان تمام مخلوقات کا خالق ہے تب آپ کو اس میں شک ہو رہا ہے کہ وہ اس کائنات کے ہر ذرہ کی حالت و کیفیت اس کی ابتدا و انتہا اور اس کے آخری ٹھکانے اور انجام کی پوری پوری خبر رکھتا ہے؟

کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟
حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ
اللطيفُ الخبيرُ۔

(الملك - ۱۴)

یہ بات کہ رب العالمین کائنات میں موجود ہر شے کو جانتا ہے بالکل ظاہر و باہر ہے اور اس کائنات کے مطالعہ کے تعلق سے انسان کی بصیرت جتنی جتنی بڑھتی جائے گی اتنا ہی اس کا یہ یقین بھی بڑھتا جائے گا کہ علم الہی اتنا وسیع و ہمہ گیر ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ماضی یا حال و مستقبل کی کوئی خبر بھی اس سے اوجھل رہ جائے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ شَيْءٌ - غیب کا علم رکھنے والا اس سے ذرہ برابر

کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ
زمین میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ
اس سے بڑی رتبہ کچھ ایک نمایاں قدر
رکتاب میں درج ہے۔

ذَرَّةٌ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ
وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ
إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ۔

(سبا - ۳)

لیکن یہ کتاب مبین کیا ہے؟

علم الہی کا رجسٹر، جس کی صفت اوپر بیان کی گئی، ایسا زبردست رجسٹر ہے جو
پورے وجود کو اور اس کی ہر اگلی پھلی چیز کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔
یہ حماقت ہی ہوگی کہ آپ یہ گمان کرنے لگیں کہ مخلوقات جو کچھ کمرہ ہی ہیں اللہ
اسے نہیں جانتا۔ وہ ہمیشہ سے ہی سب کچھ جانتا ہے۔ ورنہ وہ نہ خالق و رازق ہوتا
نہ خیر و شر پر جزا دینے والا مالک و مختار۔

جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں
میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی
ہوئی موجود ہے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ قَدْرُهُ فِي الْكِتَابِ وَكُلُّ
صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَقَرٌّ۔

(القمر ۵۲-۵۳)

جی ہاں! ہمہ گیر و نکتہ رس علم الہی کے رجسٹروں میں ہر چیز لکھی ہوئی ہے۔
اور قرآن کریم بار بار اس حقیقت پر زور دے چکا ہے۔

کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں
یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو
اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے
ایک کتاب (یعنی نوشتہ تقدیر) میں لکھ
نہ رکھا ہو۔ ایسا کرتا اللہ کے لیے بہت
آسان کام ہے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ
وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ قَبْلَ
أَنْ نُنزِّلَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ
يَسِيرٌ۔

(الحديد - ۲۲)

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ، اس علم سے ہمارا کیا تعلق ہے؟
کیا اس علم کی سچائی جس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ ہمارے

ارادہ اور ہمارے اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے۔؟
جواب ہے: نہیں۔ اور جو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم لوگوں کو عمل یا ترکِ عمل پر مجبور کرتا ہے۔ وہ غلط کہتا ہے۔

جو کچھ ہم خود سے کرتے ہیں یا جو کچھ ہمارے ساتھ ہوتا ہے علم الہی کا کام اس کا سبب بننا اور اس کی رہنمائی کرنا نہیں ہے۔

بلکہ اس کا کام انکشاف و ادراک کے نظریہ سے زیادہ نہیں اور یہ کمالِ الہی کے معاملات میں سے ہے۔

اور ہم جب اس کا اعتراف کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شانِ عظمت و بلندی کا اعتراف کرتے ہیں۔



کوئی کہہ سکتا ہے کہ: یہ مان لیا جائے کہ علم الہی کا لوگوں کو خیر یا شر پر مجبور کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔

اور یہ کہ کتابِ ازل ایک ایسا رجسٹر ہے جس کا معاملہ ہم سے متعلق نہیں اگرچہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔

لیکن مشیتِ الہی جو نافذ ہے جب اس محیطِ علم کے ساتھ مل جائے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو جیسا چاہا پیدا کیا، جیسے چاہا اس کے عناصر ترتیب دیے، جیسے چاہا مخلوق کے مراتب میں ہم آہنگی پیدا کی اور وہ جو بھی چاہتا ہے کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مشیت و قدرت کے ہاتھ میں کھلوتا ہے۔

سابقہ علم کے ساتھ، انسانوں کا اپنا کوئی وجود ہے نہ اختیار۔

ہم کہیں گے: یہ ارادہ الہی کا طفلانہ تصور ہو گا اور اس طرح کے تصور نے بعض مریض ذہنوں کو روشنی سے تاریکی میں پہنچا دیا۔

وہ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے کہہ دیتا ہے

”ہوجا“ پھر یہ لفظ ادا ہوتے ہی پلک بھٹکتے صحرانگزار ہوجاتا ہے، غربت دولت سے بدل جاتی ہے، بانجھ اولاد والی ہوجاتی ہے اور شکت خوردہ فتح یاب ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ طفلانہ خیال ہے۔

ارادۃ الہی اس سنت الہی کا نام ہے جو اس نے کائنات کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور جس کی بنیاد پر آسمان وزمین کا نظام قائم ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ عدم کو یہ حکم نہیں دیتا کہ آدمی ہوجا اور اچانک ایک بھر پور آدمی سامنے آجاتا ہے۔

ہرگز نہیں۔ بلکہ سارے کام اسی ترتیب کے ساتھ چلتے ہیں جو پروردگار عالم نے مقرر فرمائی ہے یعنی یہ کہ وہ انسان پہلے نطفہ بنتا ہے، پھر جنین، پھر نوزائیدہ، پھر بچہ، پھر لڑکا پھر پورا انسان۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کوئی بچہ پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو یہ ارادہ حسب معمول عمل کے تسلسل سے گزرتا ہے۔ پہلے بیج ڈالا جاتا ہے، پلوے کو پانی دیا جاتا ہے، ماہ و سال گزرتے ہیں، سردی و گرمی کے مراحل آتے ہیں اور بچہ تیار ہونے تک دیکھ بھال کرنے والے ہاتھ برابر اپنی ذمے داری ادا کرتے رہتے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذمے داریوں کے مطابق مادی و معنوی خصوصیات سے نوازا ہے۔ اسے بلاشبہ آزادی دی گئی ہے۔ یہی اس کے لیے ارادۃ الہی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسان کو کچھ اور بنا دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو صرف ایک پہلو کے ساتھ تخلیق فرمایا اگرچہ انہیں ادراک کی قوت بھی دی۔

جبکہ انسان کی فطرت میں مختلف پہلو رکھ دیے اور اسے اس کی صلاحیت دی کہ وہ دائیں بائیں جیسے چاہے اپنا رخ کر سکتا ہے۔

یہی انسان کے لیے ارادۃ الہی ہے اس میں کوئی جبر نہیں۔

بعض نا سمجھ ارادۃ الہی کا تصور ایسا رکھتے ہیں جو جہالت و کوتاہ فہمی پر مبنی ہے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ ارادہ الہی کوئی اندھیرے کا تیر ہے جو بغیر کسی تیاری اور مقصد کے چلایا جاتا ہو۔ اور اس طرح کی پریشان خیالیوں کا نام قضا و قدر رکھتے ہیں جبکہ اسلام اس سے بالکل بری الذمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کسی کو کسی معاملے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس کا ارادہ اس کائنات میں بلندی پر فائز ہے جب ہر وجود اس کا مہربانِ منت ہے تو اس کی مشیت پر اعتراض کون کر سکتا ہے۔ اہل عقل و دانش کو اس ارادہ الہی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اشیاء کی خصوصیات، صلاحیتوں اور طاقتوں کی فطرتیں اور مخلوقات کے امتیازی اوصاف اس عظیم ارادہ الہی کا ٹھوس ثبوت اور منظر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ حیوان گونگا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں اسکی ذمے داری صرف اس کو حاصل شدہ مادی صفات کے تابع ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ انسان صاحب عقل اور مکلف ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں انسان کی ذمہ داری اس کو عطا کی گئی صلاحیتوں اور طاقت و آزادی کے تابع ہے۔

اب جو انسان اپنی صلاحیت اور ارادہ سے دستبردار ہو جائے اور اپنے آپ کو گونگے حیوان یا نباتات کی طرح سمجھنے لگے تو وہ گویا اپنے پروردگار اور خود اپنے وجود کو جھٹلا رہا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہہ کر معطل پڑے رہتے ہیں کہ ہمیں کوئی طاقت حاصل نہیں نہ ہمارا کوئی ارادہ و اختیار ہے۔ جب ہر شے پہلے سے لکھی جا چکی ہے تو عمل کس لیے کیا جائے، جو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی وہی ہوگا۔

اس طرح کی بات اسلام پر بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کی صورت مسخ کرنا ہے اور اس زندگی میں انسان کی ذمے داری سے فرار ہے۔

قاضی ابوبکر بن عربی کہتے ہیں: انسان سے بہتر اللہ تعالیٰ کی کوئی دوسری مخلوق نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے قدرت و صلاحیت والا، بات چیت کرنے والا، سننے والا، دیکھنے والا اور حکمت و تدبیر والا بنایا ہے۔

اور یہ صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صفات پر پیدا کیا ہے۔"

اب دیکھیے پہلے سے مشیتِ الہی نے کیسے چاہا کہ انسان اس بہترین طرز پر پایا جائے۔

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اس کو سننے اور دیکھنے والا بنایا، ہم نے اسے راستہ دکھا دیا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ
نَبْتَلِيهِ فَيَحْكُمْنَا هُوَ سَمِيعًا بَصِيرًا
إِنَّا هَدَيْنَا السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا
وَإِمَّا كَفُورًا۔

(الدھر - ۲ - ۳)

اس کے باوجود کچھ لوگ اپنی مفروضہ ذمے داری و کروار اور اپنی حقیقت کا انکار کر بیٹھے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنی صلاہتوں اور ارادہ و اختیار سے دستبردار ہو جاتے ہیں کہ صلاحیتِ اللہ ہی کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی سب کچھ ہے۔ یہ فکر و ادناک کی کوتاہی کے سوا کچھ نہیں۔

اسلام میں اس مفہوم کے ساتھ قضا و قدر کا کوئی وجود نہیں۔ قضا و قدر تو یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو کمالِ مطلق کے ساتھ پہچانیں جیسا کہ پہچانا چاہیے اور پھر اپنے طرزِ عمل پر اس پہچان کے اثرات کی چھاپ لگائیں۔ محض ذمے داری سے بچنے کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طاقت و مشیت و اختیار کی بات کریں۔

قضا و قدر اور اللہ تعالیٰ کے مطلق اقتدار کی بات تو نتائج کے مطالعہ کے وقت مناسب ہوتی ہے نہ کہ اسباب اختیار کرتے وقت۔

اس لیے کہ اسباب اختیار کرتے وقت آپ وہ ذمے داری ادا کرتے ہیں جس کا آپ کو موقع دیا گیا ہے اور جس کے لیے آپ کو پیدا کیا گیا ہے۔ اب اگر نتائج آپ کی پسند کے مطابق نکلتے ہیں تو آپ کو اپنی ذمے داری کی ادائیگی پر خوش ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق پر شکر ادا کرنا چاہیے ورنہ وہ رکاوٹ ڈالنے پر بھی قادر تھا۔

اور اگر نتائج آپ کی طاقت سے باہر کے اسباب کی وجہ سے آپ کے اندازے کے خلاف نکلتے ہیں تو آپ یہ سمجھ کر اطمینان حاصل کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی تھی۔ کسی شکست یا محرومی پر آپ کو ہائے توبہ مچانے کی ضرورت نہیں۔
 قضا و قدر کا عقیدہ جو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے اور جو کچھ انسان کی ذمے داری ہے ان دونوں کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے ورنہ انسان سرکشی اور بھول کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔

سرکشی اس بنیاد پر کہ وہ اس کائنات میں اپنے آپ کو سب کچھ سمجھنے لگے اور یہ بھول جائے کہ اپنی بلند خصوصیات کے باوجود وہ کچھ معاملات کے آگے مجبور ہے جو اس کے ارادہ و صلاحیت کو ناکام کر سکتے ہیں اور اسے خواہی نہ خواہی یہ یاد دلا سکتے ہیں کہ کائنات کو اب بھی اس کا خالق حقیقی چلا رہا ہے اور اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے معاملے پر قادر و غالب ہے۔

اگر پوری توجہ اور سلامت ذہنی کے ساتھ اپنے ارد گرد، اپنے سے پہلے و بعد کے حالات، خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو پیش آنے والے واقعات پر غور کرتے تو آپ کو اس میں ذرا بھی شبہ نہ رہ جاتا کہ تمام لوگوں کے حالات پر اعلیٰ ترین نگرانی پورے انضباط اور باریک بینی پر مبنی ہے اور رات و دن کی لٹ پھیر کرنے والے نے جو حدود مقرر کر دی ہیں انہیں کے دائرے میں لوگ چکر لگا رہے ہیں وہی چلاتا اور مارتا ہے اور وہی کھینچتا اور ڈھیل دیتا ہے۔

آپ کو ارادہ اور فکر و عمل کی آزادی حاصل ہے۔

اور آپ کو انصاف و حکمت کے ساتھ بھلائی کا بدلہ ملے گا اور برائی پر

مواخذہ ہوگا۔

آپ کو حکم دیا جاتا ہے اور منع کیا جاتا ہے کیونکہ آپ میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ آپ امر و نہی کو قبول کر سکیں۔ اسی طرح عمل اور ترک عمل کی صلاحیت دی گئی ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود آپ ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہیں اور اس منصوبے کو وہی جانتا ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے اور جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور اس بڑے منصوبے کا حصہ بننے کی وجہ سے آپ زندگی کی راحت و رنج اور نعمت و مصیبت کے مختلف معاملات میں محکوم ہیں اور جس چیز میں آپ مجبور ہیں اس پر آپ کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں پر لوگوں کا محاسبہ ہرگز نہیں کرے گا جو انہوں نے خود نہیں کمائی ہیں۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَا لَكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔
(الاحزاب - ۵)

نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو اللہ درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کریم میں کچھ آیتوں سے بظاہر جبر معلوم ہوتا ہے اور کچھ آیتوں سے بظاہر اختیار معلوم ہوتا ہے۔

اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں ایک قسم کی آیتیں حقیقت کے ایک حصہ کی نمائندگی کرتی ہیں اور دوسری قسم کی آیتیں حقیقت کے دوسرے حصہ کی۔

اختیار والی آیتیں متعلق ہیں ان اعمال سے جن کا لوگوں کو مکلف بنایا گیا ہے اور زندگی میں جو تصرفات اور ان کے نتائج لوگوں کے لیے لازم ہیں۔

تخلیق، رسالت، ثواب، عذاب اور الہی انصاف اسی پہلو پر مبنی ہیں اور یہ عقلاً و نقلاً مسلم بات ہے۔

اس ظاہر و باہر چیز کو نہ ماننا گویا یہ ماننا ہے کہ زندگی ایک استہزائیہ ڈرامہ اور آسمانی المیہ ہے۔

اور یہ کہ کرتا تو خود اللہ تعالیٰ ہے اور جزا یا سزا دوسروں کو دیتا ہے۔
 اور یہ کہ اللہ تعالیٰ امر و نہی کے احکام جاری فرماتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ اس
 امر و نہی کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

اس طرح کی بات سوائے پاگل پن اور الزام تراشی کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ
 کی ذات اس سے بہت بلند تر ہے۔

رہیں جبر والی آیتیں تو ان کا تعلق اس بڑے عام منصوبہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ
 نے انسانی زندگی کے لیے تیار فرمایا ہے اور اس منصوبہ میں ہمارا کوئی بھی دخل نہیں۔
 چاہے وہ ہمارے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ہی اس دنیا میں ہماری آمد کی جگہ و وقت کا تعین فرمایا ہے اور
 اسی طرح یہاں سے واپسی کا بھی عقل و ذہانت کی مقدار و سطح، مزاج کی شدت یا نرمی،
 جموں کی ساخت، لبائی یا کوتاہ قامتی، خوبصورتی یا بد صورتی، شخصیات کی نوعیت،
 ماحول، والدین، اولاد، خون میں وراثت کے اثرات، صحت، رزق میں کشادگی یا تنگی وغیرہ۔
 ان ساری چیزوں کا تعلق ظاہراً و باطناً زندگی کے مالک ہی سے ہے۔ اسی طرح اس
 نے ان مادی و معنوی صلاحیتوں کا بھی تعین کر دیا ہے جو اس محدود عمر میں ہماری جدوجہد
 کے لیے ہمیں بخشی گئی ہیں یا بخشی جائیں گی۔ پھر ہمیں جو اختیار کا پہلو دیا گیا ہے وہ ان
 صلاحیتوں کی فطرت سے کمیت و کیفیت کے اعتبار سے گھرا ہوا ہے۔

انسان — چاہے کچھ صلاحیت رکھتا بھی ہو — خالق نہیں ہے اور وہ —
 چاہے مدبر ہو — معبود نہیں ہے کہ جو چاہے کرے کتنے ہی صحیح عزم اپنی تکمیل کے
 وسائل کی وجہ سے پورے نہیں ہو پاتے کیونکہ وہ وسائل انسان کے بس ہیں نہیں ہوتے۔
 مختصر یہ کہ انسان اپنی ذمے داری کے دائرے میں آزاد بھی ہے اور اپنے پروردگار
 کی فرماں بردار اس وسیع کائنات کے دائرے میں غلام بھی۔

انجام

ہماری نگاہوں کے سامنے سے جنازے گزرتے ہیں اور اپنے انجام کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں ہم انہیں دیکھتے ہیں تو وقتی طور پر غم ورنج طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن جلد ہی زندگی اپنے معمول پر آجاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہم نے جو کچھ دیکھا تھا اسے بھول چکے ہیں پھر وہ منظر ہمارے ذہن سے بھی نکل جاتا ہے۔

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ موت انسانی زندگی کا خاتمہ ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا احساس و عقل اور اس نے جو کچھ بھلائی یا برائی کر رکھی ہے اس کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

مادہ پرست لوگ سمجھتے ہیں کہ موت زندگی کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہے۔ اس کے بعد انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا، ہاں کچھ دنوں تک اس کا ذکر کبھی کبھی نکل آتا ہے پھر وہ بھی فراموشی کی مٹی میں دفن ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ سب، اسلام کی نگاہ میں گمراہی اور غلط ہے۔

موت تو انسانی زندگی کے تسلسل میں ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔

موت کے ساتھ ہی انسان ایک دوسری دنیا میں جنم لیتا ہے جس میں اس دنیا میں اس کے کیے و کئے کا حساب ہوتا ہے۔

قبر کے عذاب کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہماری اس دنیا میں مجرمین کے ساتھ ہوتا ہے۔

ایک مجرم پکڑا جاتا ہے، پولیس اسے اپنی تحویل میں رکھ کر ابتدائی تحقیقات کرتی ہے۔ پھر اسے عدالتی تحویل میں دے کر جیل پہنچا دیا جاتا ہے جہاں عدالتی مقدمہ کی کارروائیاں پوری کی جاتی ہیں۔

اسی طرح قبر کے ثواب کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو انعام دینے کے لیے طلب کیا جائے، وہ اپنی بہترین آرائش کے ساتھ خوش دلی سے متعلقہ دفتر تک جاتا ہے وہاں پہنچتے ہی گرم جوشی سے اس کا استقبال ہوتا ہے اور اسے عزت سے بٹھایا جاتا ہے اور پھر عزت کے ساتھ انعام اس کے حوالے کیا جاتا ہے۔ یہی عالم ارواح میں بھی ہوتا ہے۔

نبیوں کے لیے اچھا بدلہ اور بروں کے لیے سخت سزا ضروری ہے۔ قرآن کریم نے اس متوقع نعمت اور عذاب کی تصویر کشی کی ہے تاکہ لوگ زندگی اور دنیا کے دھوکے اور فتنے میں غرق نہ ہوں۔

ساتھ ہی وہ بھلائی سے حاصل ہونے والی عزت و بلندی کو یاد دلا کر بھلائی کرنے کی بار بار ترغیب دیتا ہے۔

اور برائی کے عبرت ناک نتائج کو یاد دلا کر برائی سے رکنے کے لیے بار بار ڈراتا ہے۔

لوگ اپنی اس زندگی میں بھی مادی سزاؤں سے بے نیاز نہیں ہوتے کیونکہ یہاں وہ صرف روح کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کی مادی ترکیب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جب یہاں انسانی وجود کو وہ جسمانی ہیئت اور خصوصیات حاصل ہیں جن کی بنا پر وہ مثلاً فرشتوں سے الگ حیثیت رکھتا ہے تو پھر مادی جزا و سزا کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن کریم نے متقیوں کے لیے تیار کی گئی جنت اور منکرین کے لیے تیار کی گئی جہنم کے بارے میں جو طویل گفتگو، مختلف مواقع پر اور مختلف پہلوؤں سے کی ہے اس میں یہی راز پنہاں ہے۔

اور اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان آخرت میں اپنے مادی و روحانی دونوں وجودوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیش کے لیے رہے گا اور دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اسے جو امتیازی خصوصیات حاصل ہیں وہ ختم نہیں ہو جائیں گی چاہے ان کی نوعیت اور حالت بدل جائے۔

اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھنا چاہیے۔ اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ہماری زندگی کا سلسلہ اس زمین سے رخصت ہونے کے بعد بھی چلتا رہے گا۔

ہمیں یقینی طور پر یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس دنیا میں گناہ اور برائی کا انجام آخرت میں تباہی و بربادی ہوگا چاہے اس دنیا میں گناہ گار کو کچھ مہلت اور راحت ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے۔

اسی طرح بھلائی اور نیکی کی جدوجہد کرنے والا چاہے اس دنیا میں کچھ تکلیف اور تنگی ہی کا شکار رہے آخر کار بہترین انجام اس کے انتظار میں ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ
الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا
وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ
أَتَيْنَاهَا وَكُفًىٰ بِمَا حَسِبْتَنَ
(الانبیاء۔ ۴۷)

قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے
والے ترازو رکھ دیں گے پھر کسی شخص
پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا جس کارائی کے
وائے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم سامنے
رے آئیں گے اور حساب لگانے کے لیے

ہم کافی ہیں۔

آخرت بالکل حقیقی چیز ہے اور اسے کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا
لیکن اس کا مطلب دنیا سے آنکھ پھیر لینا نہیں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ مستقبل
کی بات کریں اور اس کے لیے تیاری کی ضرورت پر زور دیں لیکن اس کا مطلب
ہرگز نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے حال اور اس کی ضروریات کو
نظر انداز کر دیں۔

جب اس حقیقت کو ذہن میں نہیں رکھا جاتا تو نتیجہ کے طور پر اچھائی سے زیادہ خرابی پیدا ہوتی ہے اور عام ذہنوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آخرت میں نجات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک آدمی دنیا میں پراگندہ حال نہ رہے جب کہ یہ زندگی کے حقائق، مادہ کے قوانین اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت سے ناواقفیت کی بات ہے۔

بلاشبہ دین میں آخرت اور جنت و جہنم کے بارے میں بہت ساری باتیں موجود ہیں لیکن ان کا مقصد انسان کو صحیح راہ پر لانا، آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے سے روکنا اور اسے وسیع تر افق اور دائمی زندگی کی طرف متوجہ کرنا ہے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بخشش ہوئی صلاحیتوں سے کام نہ لے کر مجبوری و بے چارگی اختیار کرنا نہیں ہے۔

پزندگی

یہ زندگی

عام طور پر یہ سمجھایا گیا ہے کہ سارے مذاہب — عام طور پر — زندگی کے حریف ہیں اور زندگی اپنی موجودہ علمی و عمرانی سطح تک اس کے بعد ہی پہنچنے میں کامیاب ہو سکی جب اس نے دینی تعلیمات اور اس دنیاوی زندگی کے بجائے اس کے بعد کے مراحل کے تعلق سے مذہب کے زور و اہتمام سے بچھا چھڑا لیا۔

ہمیں یقین ہے کہ کم از کم اسلام کے تعلق سے یہ بات بالکل ہی غلط ہے۔ اسلامی تعلیمات پر معمولی شور و تاثر سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان کی تکمیل، بہترین طرز فکر اور زندگی و کائنات میں عمل و سرگرمی کے درمیان مضبوط رشتے استوار ہیں۔

قرآن کریم انسان سے، دنیا کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتا ہے جیسے کوئی بہت مالدار آدمی اپنے وسیع املاک اور عظیم وسائل کی بات کرے۔

اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ کیونکہ انسان — اسلام کی نگاہ میں — اس دنیا کا بادشاہ اور مخدوم و آقا ہے۔

انسان کے بارے میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ:

کے کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو اللہ نے تمہارے کام میں رکھا اور تم پر اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں پوری کر دیں۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمِمَّا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً۔

(لقمان - ۲۰)

سورج ہمارے لیے ہی نکلتا اور ڈوبتا ہے۔
آسمانوں پر چمکتے ہوئے ستارے ہماری ہی آنکھوں کے لیے زینت اور رہنمائی کا ذریعہ بنائے گئے ہیں۔

کیا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا۔
اس نے اس کو بنایا، اس کا ابھار اونچا
کیا پھر اس کو برابر کیا اور اس کی رات
اندھیری کی اور اس کی دھوپ کھول نکالی
اور زمین کو اس کے پیچھے صاف بچھا دیا۔
زمین سے اس کا پانی اور چار بابہز نکالا اور
پہاڑوں کو قائم کر دیا تمہارے اور تمہارے
چوپایوں کے کام چلانے کو۔

أَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءِ بَنَاهَا
رَفَعَ سَمَكَهَا فَسَوَّاهَا وَأَنْفَطَشَ
لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا وَالْأَرْضَ
بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا أَخْرَجَ مِنْهَا
مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا
مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ۔

(النازعات ۲۷-۳۰)

زمین کو کھیتوں سے سوارا گیا تاکہ ہمیں غذا فراہم کریں، باغات سے سجایا گیا تاکہ ہمارے
دل و دماغ اور نگاہوں کو سرور بخشیں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے ان کی ضروریات بھی فراہم
کر دیں اور تفریحات بھی۔ اور ان سب کے بعد وہ ان سے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا
کہ وہ اسے سیکتا سمجھیں۔

بھلا کس نے آسمان اور زمین بنائے اور
تمہارے لیے آسمان سے پانی اتار دیا پھر
اس سے ہم نے رونق والے باغ اگائے۔
تمہارا کام نہ تھا کہ ان کے درخت اگائے
اب اللہ کے ساتھ کوئی اور حاکم ہے۔
کوئی نہیں وہ لوگ راہ سے مڑتے ہیں۔

أَمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَ
أَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا
بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا
كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنبِتُوا شَجَرَهَا أَلَيْسَ
مَعَ اللَّهِ بَلَدٌ هُمْ قَوْمٌ يَعْتَدُونَ۔

(النمل - ۶۰)

صحیح ایمان کی عمارت ان عناصر سے ہی مکمل ہوتی ہے جو کائنات پر غور و فکر سے
حاصل کیے جاتے ہیں، اور صحیح نگاہ جس قدر ان عناصر کو حاصل کرے گی اسی قدر ایمان
بڑھے گا۔ بعض لوگ اپنی جگہ پڑے رہتے ہیں وہ نہ صحیح طور پر سوچ پاتے ہیں نہ ہجرت حاصل کر پاتے ہیں۔
اپنی اپنی جگہوں کے قیدی اور آنکھیں بند کیے ہوئے ایسے ہی لوگوں کو قرآن تعلقین کرتا
ہے کہ وہ دنیا میں گھومیں پھریں، شاید اس طرح ان کی منجند عقولوں میں حرکت پیدا ہو اور

عظیم حقائق کے ساتھ ان کا تعلق قائم ہو سکے۔

اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَتَكُونُ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا وَاذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا۔ (الحج - ۲۶)

کیا انہوں نے ملک کی سیر نہیں کی جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے۔

انسانوں کا رشتہ کائنات کے ساتھ جوڑنے اور کائنات کے مظاہر اور رموز و اسرار کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانے کے تعلق سے قرآن کریم ایک مثالی کتاب ہے۔ اس نے انسانوں کی مادی زندگی کو حسن عمل سے اور ان کی معنوی زندگی کو کائنات پر بہترین انداز میں غور و فکر کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ صحیح زندگی کے ساتھ لوگوں کو وابستہ کرنے کے سلسلے میں اس سے زیادہ کیا بہترین رہنمائی ہو سکتی ہے؟

• زمانہ قدیم سے لوگ دین کو غلط سمجھنے، دین کے نام پر زندگی سے کشمکش کرنے، لوگوں کا تعلق زندگی سے کمزور کرنے اور دنیا کو ایک بڑا چیلنج بنانے کے امراض کا شکار ہوتے آئے ہیں۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کی سختی سے تردید کرتا ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا كُنْتُمْ تُكَذِّبُونَ
الْكُذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ
لِنَفْسِنَا وَعَلَى اللَّهِ الْكُذِبُ اِنَّ
الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ
لَا يُقْلِحُونَ۔ (النحل - ۱۱۶)

اور اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر بہتان باندھو۔ بے شک جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں ان کا بھلا نہ ہوگا۔

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ زندگی بالکل بے ترتیب و انتظام چیز ہے، وہ دنیا میں اتفاقاً پیدا ہو گئے ہیں اور خود یہ دنیا بھی اتفاقاً پیدا ہو گئی تھی اس لیے جو چاہیں کریں اسلام ایسے لوگوں کی نا سمجھی کو مسترد کرتا ہے اور صاف اعلان کرتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ عمر مرحمت فرمائی ہے اور اس دنیا میں بسایا ہے تو اس لیے کہ ہم اسے پہچانیں نہ کہ اس کا انکار کریں۔ اور اس کا شکر ادا کریں نہ کہ اس کی نافرمانی کریں۔ اس طرح دین زندگی کا دشمن نہیں۔ نہ زندوں کے لیے وبال جان ہے۔

خواہشات کی نہیں

عقل کی آزادی

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اس کی کائنات پر غور کریں اور اس کائنات کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے اور ان کے ذریعہ پروردگار کی حکمت عالیہ کا سراغ پانے کے لیے اپنے خیالات کو وسیلہ دیں۔

پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیچھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔

پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے ہم نے خوبیاں لندھایا پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا پھر اس کے اندر اگائے غلے اور انگور۔

اچھا، تو کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا، کس طرح ہم نے اسے بنایا اور راستہ کیا۔

اور اس میں کہیں کوئی رخنے نہیں ہے۔

تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کسے

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّا خَلَقَ فُلْيَقْ
مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ يَخْرُجُ مِنْ
بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ۔

زالطارق ۵-۷

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ أَنَا صَبَبْنَا
الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا
فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا۔

(عبس ۲۳-۲۴)

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ نُورَتْهُمْ
كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا مَا لَهَا مِنْ
فَرْجٍ۔

(ق-۶)

أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ

خَلَقَتْ - (الغاشیہ - ۱۷)

بنائے گئے۔

قُلْ اَنْظُرُوا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ان سے کہو زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔

(یونس ۱۰۱)

اس غور و فکر کے دو پہلو ہیں:

یہ وسیع دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں بے سوچے سمجھے نہیں بنائی گئی ہے نہ اس کی تعمیر کا ساز و سامان بغیر کسی ترتیب و منصوبہ بندی کے بس ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بہترین طور پر پیدا کیا ہے اور ساری چیزیں جنہیں ہم دیکھ سکتے ہیں یا جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں — مرتب نظام اور حرکت سے بھر پور قوانین کے مطابق بنائی ہیں۔ کائنات کی ساری حرکات و سکنات ایک نظام کے دائرے میں ہیں جس میں کوئی خلل واقع نہیں ہو سکتا۔ ہوائیں اگر فضا میں ایک پتہ بھی اڑاتی ہیں تو اس کی بلندی و پستی ایک قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

پانی میں جو جسم بھی ڈالا جاتا ہے اس کا ڈوبنا اور تیرنا ایک قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

زمین سے جو پودا بھی نکلتا ہے اس کا رنگ، پھل اور مزہ ایک نظام کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْاَرْضَ مَدَدْنَا هَا وَالْقَيْنَا فِيْهَا رَوٰسِي وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ۔

ہم نے زمین کو پھیلا دیا، اس میں پہاڑ جمائے، اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ آگائی۔

(الحجر - ۱۹)

کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل

وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزٰئِنُهٗ وَمَا نُنزِلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔

کرتے ہیں مقررہ مقدار میں نازل کرتے
ہیں۔

ہم نے ہر چیز ایک اندازہ کے ساتھ پیدا
کی ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ -

(القمر - ۲۹)

پھر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ہمیں یہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز
حق کے ساتھ پیدا کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تخلیق میں کسی تضاد، بے
معنویت یا نادر کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

یہ آسمان اور زمین اور ان کے درمیان
کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں
بنادی ہیں۔ ان کو برحق پیدا کیا ہے مگر ان
میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا
بَيْنَهُمَا لِالْعِبِيْنِ وَمَا خَلَقْنَا هُمَا إِلَّا
بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ -

(الدخان ۳۸ - ۳۹)

اب یہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ کائنات کی کھلی ہوئی کتاب کی ورق گردانی
کریں تاکہ ایسے حقائق سے آگاہ ہو سکیں جن سے ایک طرف اس دنیا کے بارے میں
ان کا علم گہرا ہو دوسری طرف اس دنیا کے خالق کی عظمت پر یقین و ایمان مزید بڑھے۔
یہاں اب دوسرا مرحلہ قابل غور ہے۔

انسانے آدم علم و واقفیت لے کر پیدا نہیں ہوتے یا ان کے دلوں میں علم
اس طرح داخل نہیں ہو جاتا جس طرح کسی خالی برتن میں پانی یا ہوا داخل ہو جاتے ہیں۔
علم و معرفت کے حصول کے لیے منظم جدوجہد، مسلسل عمل اور انتھک کوشش
کی ضرورت ہے۔

ایسی کوشش جس میں انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور اس کی مادی و

معنوی خصوصیات سب شامل ہوں۔

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں
سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ
لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ

وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ۔ (النحل - ۷۸)

تھے اس نے تمہیں کان دیے، آنکھیں دیں
اور سوچنے والے دل دیے اس لیے کہ
تم شکر گزار بنو۔

ہم جب پیدا ہوتے ہیں تب کچھ بھی نہیں جانتے۔ لیکن سماعت و بصارت اور
غور و فکر کے وسائل کے ذریعہ تعلیم کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ ان وسائل کا پوری باریک بینی
سے محاسبہ ہوگا اس لیے ان کی بے قدری نہیں کرنی چاہیے اور ان کے ثمرات کو رائیگاں
نہیں کرنا چاہیے۔

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ
كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ (نبی اسرائیل - ۳۶)

یقیناً آنکھ، کان اور دل سب کی باز پرس
ہونی ہے۔

یہ انسانی صلاحیتیں اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ کائنات کے حقائق کے ساتھ
ہم آہنگی پیدا ہو سکے، کائنات کے خزانے کھولے جاسکیں اور اس کے اسرار و رموز کا انکشاف
کیا جاسکے۔

ان صلاحیتوں کا مقصد حق کو اپنانا اور زندگی کے راستے کو اس کی روشنی میں
طے کرنا ہے نہ کہ باطل کا ساتھ دینا اور ہر وادی میں چکر کھانا۔

اسلامی تہذیب شروع میں مفید حقیقت کے میدان میں فکر و نظر کو کام میں لانے
کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی تو اس نے خود بھی بہت کچھ فائدہ حاصل کیا اور دنیا کو بھی بہت
کچھ فائدہ پہنچایا۔

حالیہ دور میں سائنس کی درس گاہوں نے جو بھی پیش رفت کی ہے کیا وہ پہلے
کے عربوں کے فکر و نظر کی خوشہ چینی نہیں ہے؟



لیکن اسلام نے جہاں فکری آزادی دی وہیں خواہشات کو بے رگام نہیں چھوڑ دیا
بلکہ ان کے لیے کچھ حدود و ضوابط مقرر کیے، دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لیے اس
نے باریک بینی کے ساتھ بہت سے بند باندھے۔

انسان کی طاقت محدود ہے۔ اگر آپ اسے لہو و لعب اور بے لگام خواہشات میں ضائع کر دیں تو بھلائی و سنجیدگی کی راہ پر کیسے چلا جاسکے گا۔ پھر دنیا صبح راستے سے بھٹکنے کے علاوہ کہاں رہ جائے گی۔

دنیا کو جو کچھ بھلائی پہنچ سکی ہے وہ فکر و نظر کی آزادی ہی سے پہنچ سکی ہے اور جو کچھ بُرائی ملی ہے وہ خواہشاتِ نفسانی وغیرہ ہی سے پہنچی ہے۔

ان دونوں آزادیوں کو خلط ملط کرنا مناسب نہیں ہے۔

ابنائے آدمؑ علم کے ذریعہ تو فرشتوں سے ہمسری کرتے ہیں:

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ
وَالْمَلِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا
بِالْقِسْطِ۔

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں۔

(آل عمران ۱۸)

دیکھیے اللہ تعالیٰ نے اہل علم کو کس درجے میں رکھا ہے۔

لیکن یہی ابنائے آدمؑ خواہشاتِ نفس اور گمراہیوں میں پڑ کر حیوان کے درجے

تک گر جاتے ہیں:

کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا، ہو کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ
أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكَيْدًا أَمْ تَحْسَبُ
أَنَّ الْكَثْرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ
إِنَّ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ
أَضَلُّ سَبِيلًا۔

وہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

(الفرقان ۲۳ - ۲۴)

اسلام عقل کو حرکت میں لاتا ہے اور اس کے لیے سازگار فضا پیدا کرنے میں ہر

مددگار چیز کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اسی آزادانہ فکری تحریک کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

اے نبی! ان سے کہو کہ میں تمہیں بس ایک
بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے
تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ
لڑاؤ اور سوچو۔

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَا حِدَّةٍ أَنْ تَقُومُوا
لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا -
(سبا - ۱۲۶)

لیکن ساتھ ہی وہ خواہشاتِ نفس کو بے لگام نہیں رہنے دیتا اور اس کے انجام
سے ڈراتا ہے:

فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا
فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (النازعات ۲۷-۲۹)
تو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح
دی دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی۔
اب یہ آزادی کے علم برداروں کی ذمے داری ہے کہ وہ دونوں راستوں کے درمیان
فرق و امتیاز سے کام لیں۔

مادہ و روح

اسلام انسان کے دنیاوی و اخروی مفادات کے درمیان بھی مکمل ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور انسان کے جسمانی و روحانی تقاضوں کے درمیان بھی۔
 کیونکہ اسلام کی نگاہ میں انسان کو خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔
 مطلوبہ کمال مادی و معنوی دونوں اعتبار سے پیش رفت کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے۔

روئے زمین پر صحیح زندگی ہی بعد میں اس کی ابدی زندگی کی کامیابی کی بنیاد ہے۔ اگر یہ بنیاد ہی گر گئی تو پوری عمارت ہی منہدم ہو جائے گی۔

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ سَهْوًا
 اور جو اس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ
 فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا
 آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ راستہ
 پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔
 (زینی اسرائیل - ۷۲)

اسلام میں روح اور جسم کے درمیان کوئی کشمکش نہیں۔ یہ تقسیم تو انسان کی واحد حقیقت کے خلاف ہے۔

اس طرح اسلام میں دنیا و آخرت کے درمیان کوئی کشمکش نہیں بلکہ اس طرح کی تقسیم تو دین کے تعلق سے کج فہم لوگ کرتے ہیں۔

رہبانیت کے ذریعہ جسم کو مشقت میں ڈالنے یا زہد کے ذریعے زندگی کو دشمن بنالینے کی ساری باتیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کے برعکس ہیں اور اسلام کا ان سے



انسان کا جسم اس کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ جسم کمزور یا بیمار پڑ جائے تو انسان اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ نہ وہ علم حاصل کر سکتا ہے، نہ جہاد کر سکتا ہے۔ نہ خود اپنے آپ کو یا قوم کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔

میں نے کسی امام کی بات پڑھی کہ ایک دن وہ ان لوگوں کی باتوں سے دھوکا کھا گئے جو جسم کو حقیر سمجھتے ہیں اور اسے مشقت میں ڈالنے کی مشق کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے روح کے تزکیہ اور قلب کو منور کرنے کے لیے کھانے کی مقدار بہت کم کر دی چند ہی دنوں کی کوشش کے بعد ایسا ہوا کہ وہ جو ذمے داریاں ادا کرتے تھے ان میں بھی کوتاہی ہونے لگی اور جتنا قرآن کریم تلاوت کرتے تھے اس کی بھی سکت باقی نہیں رہی۔ تب وہ چونکے اور کہنے لگے کہ: چند لقمے چھوڑ کر وہ اپنے نفس پر وہ چیز حرام کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حلال کر رکھی ہے پھر بہت سے نیک اعمال کی ادائیگی سے بھی محروم ہو رہے ہیں۔ یہ تو شیطان کی پیروی ہے۔

بے شک طاقت ور و صحت مند جسم بڑے بڑے کام کرنے میں بہت بڑا مددگار ہے کوئی بھی عقل مند انسان جسم کو مریض و بے کار بنانے کی کوشش نہیں کر سکتا اور کوئی فریب خوردہ شخص ہی اس طرح کی بات اسلام سے منسوب کر سکتا ہے۔

ہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو طرح طرح کے کھانے گلے تک ٹھونستے رہتے ہیں اور بازوؤں کی پھلیاں دیکھنے کے لیے ہی جسم کو پردان چڑھانے میں لگے رہتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے غلط طرز فکر کے علاج کی ضرورت ہے تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ ضرورت سے زیادہ کھانا ایک مرض ہے جس کا انجام خونناک ہوتا ہے جسم کا کمال کمزور اخلاق اور کم عقلی کو عزت نہیں بخش سکتا۔

لیکن یہ گمان کرنا کہ دین جسم کے خلاف جنگ کی دعوت دیتا ہے، اسلامی تعلیمات میں اس کی کوئی بنیاد نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی سیرتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ایک قیمتی حصہ ان تعلیمات کا ہے جن میں جسم کو صاف ستھرا رکھنے اس کی حفاظت کرنے، اس کی ضروریات پوری کرنے اور اسے راحت پہنچانے پر زور دیا گیا ہے۔

ان تعلیمات کو نظر انداز کرنا اسلام پر زیادتی اور صحیح راستے سے انحراف ہوگا۔



دنیاوی زندگی میں توفیق ہی آخرت میں کامیابی کا واحد راستہ ہے اور توفیق کا مطلب دنیاوی زندگی میں ناکامی اور دنیا کے بازار میں دیوالیہ ہونا نہیں، بلکہ اس کا مطلب ہے دنیاوی زندگی کی باگ ڈور پر اختیار و قابو حاصل ہونا اور پھر اسے حق اور بھلائی کے لیے استعمال کرنا۔

ہم نے دیکھا ہے کہ بعض بو عمری صفت انسان زندگی میں اپنا مقصد حاصل نہیں کر پاتے تو دنیا کی برائی و مذمت کر کے ہی اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے مال و دولت، کائنات کے حسن و جمال، وسعت و عافیت حتیٰ کہ علم و انکشاف اور طاقت و جملہ مندی، سب کو حقیر بنانے کی کوشش کی۔ ایسے لوگ جب سے نمودار ہوئے ہیں اور ان کی باتیں پھیلی ہیں، ملت اسلامیہ کے لیے وبال بنے ہوئے ہیں۔

اسلام تو ایسا دین ہے جس کی بنیاد دنیا کی پہچان اور اس کے زبردست خزانوں کے حصول اور پھر انہیں حقیقت کی خدمت اور اس کی سربلندی کے لیے استعمال کرنے پر قائم ہے۔

اس میں زندگی سے کنارہ کشی و پہلو ہٹی اور کمزوری دینا تو انی کو اچھا سمجھنے اور جدوجہد ترک کر دینے کا تصور کیسے سما سکتا ہے؟

ہاں ایسے لوگ بھی ضرور پائے جاتے ہیں جو زندگی برائے زندگی کے قائل ہیں

اور اس سلسلے میں کسی بھی برائی میں پڑنے، کمزور افراد اور گروپوں کو ختم کر دینے اور جو کچھ بھی ہاتھ لگ جائے اسے ہڑپ کر لینے سے نہیں چوکتے۔

اس طرح کے مال و دولت، اولاد اور اقتدار کے سبزیوں کی مذمت کا مطلب پوری زندگی کی مذمت تو نہیں ہو سکتا۔

یہ تو سراسر حماقت ہوگی۔

قرآن کریم، غصہ و غرور، فتنہ آرائی، دنیا میں بدست ہونے اور اس کی لذتوں میں کھوجانے کی مذمت کرتا ہے:

لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّ الدُّنْيَا لَمَدِينَةٌ لَّكُنَّا بِهَا مُسْتَعْتَبِينَ
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا

(فاطر۔ ۵)

لیکن اس کا مطلب کیا زینت اور کشادگی کو حرام قرار دینا ہے؟

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي
آخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ

اے نبی! ان سے کہو کس نے اللہ کی اس

زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں

کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی

(الاعراف۔ ۳۲)

ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں۔

قرآن کریم نے مال و دولت اور اولاد کو دنیاوی زندگی کی زینت قرار دیا ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ آخرت کے لیے بیکار ہیں؟

آخرت کی زندگی تو اللہ کی راہ میں دولت خرچ کرنے اور اپنی جان اور اولاد کو حق کی مدد کے لیے وقف کرنے کے ذریعہ ہی طلب کی جاتی ہے۔

کیا افراد اور دولت کے بغیر بھی جہاد ممکن ہے؟

اور کیا زندگی سے ناواقفیت اور صحیح راستے پر چلے بغیر بھی کامیابی کی توقع کی

جاسکتی ہے؟

اس زندگی میں غرق مگر اس کے معاملات سے بالکل بیگانہ لوگ صرف دنیا

کے بندے ہیں جو ایمان و انصاف کے معاملات سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔
اس طرح کے دنیا کے غلام جب دین کی مخالفت کرتے ہیں تو ان کا مقصد صرف
یہ ہوتا ہے کہ دنیاوی زندگی کے سارے میدان ان کے لیے خالی ہو جائیں اور کوئی حق پرست
انہیں ٹوکنے والا نہ رہ جائے۔

بہر حال اسلام ایک ساتھ روحانی اور مادی دین ہے۔
وہ انسان کے لیے ایک معتدلانہ زندگی کی ضمانت دیتا ہے جس میں کوئی انحراف
اور کوتاہی نہ ہو۔

وہ دنیا اور آخرت کی نعمت کا ایک بلند معیار قائم کرتا ہے۔
اور ہر ایسے زہد کو مسترد کرتا ہے جس سے زندگی کی نشوونما معطل ہو جائے۔
اسی طرح ہر ایسی رہبانیت کو مسترد کرتا ہے جو جسمانی ضرورت کی تکمیل کی مخالفت
کرتی۔

مساوات

اسلامی تعلیمات کا پہلا نتیجہ خدا کے سوا کسی کی بھی بندگی کا انکار اور یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ انسان کو ساری مخلوقات میں باعزت مقام حاصل ہے اور کسی بھی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے بالاتر سمجھے۔ اسلام نے بلا استثنا تمام انسانوں کو فرائض اور عام حقوق میں ایک ہی جہی حیثیت دی ہے۔

تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اور اس بندگی سے کوئی بھی انسان مستثنیٰ نہیں۔

ان كُلَّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
إِلَّا آتَى الرَّحْمَنَ عَبْدًا ۗ لَمَّا أَحْصَاهُمْ
وَعَدَّهُمْ عَدًّا۔

زمین اور آسمانوں کے اندر جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے ان کو شمار کر رکھا ہے۔

(عن یس ۹۳-۹۴)

پھر سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کے ناطے ایک ہی خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي خَلَقَكُمْ
مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۖ وَخَلَقَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَبَثَّ فِيهِمَا رِجَالًا كَثِيرًا
وَنِسَاءً۔ (النساء ۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسکی بہان سے اسکا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں۔

اس لیے کسی نسبی تفریق یا کسی علاقائی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں۔
لوگوں کے حالات، صلاحیتوں اور زبانوں وغیرہ میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ
خالق کائنات کی قدرت کا مظہر اور دلیل ہے۔

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں
اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں
اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے یقیناً
اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمندی
کے لیے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَاجْتِلَاحَ نَسْتِكُمْ وَالْوَانِكُمْ
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِلْعَالِمِينَ

(المروم - ۲۲)

اور اس فرق و اختلاف کا مقصد باہم ایک دوسرے کی پہچان اور الفت ہے
نہ کہ نفرت و قطع تعلق۔

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت
سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور
برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے
کو پہچانو۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ
وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ
لِتَعَارَفُوا

(الحجرات - ۱۳)

انسانی خاندان پر جو فرقے و برادریاں ڈالی گئی ہیں ان سے بھی کسی غیر معذور انسان
کو متشنی نہیں کیا گیا ہے اسلام فرض کردہ عقائد، عبادات اور اخلاق و معاملات سے
یہ بات بالکل واضح ہے۔

مسجد میں خاص و عام بغیر کسی امتیاز کے صف باندھتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ کے سامنے قدم سے قدم ملا کر ساتھ ساتھ سر جھکاتے ہیں۔
اس طرح عام حقوق کی ضمانت سب کے لیے ہے کسی خون کے قصاص یا کسی
شرعی ہرزاکے نفاذ میں کسی بھی انسان کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا نہ کسی شخص
کو قاتل کے دائرہ عمل سے متشنی کیا گیا ہے۔

اسلام لوگوں کے پاس یہ مساوات لے کر اس طرح آیا تھا جیسے ایک لمبی رات کے بعد سورج طلوع ہو۔ اس سے پہلے لوگ اس عام مساوات سے آگاہ بھی نہیں تھے۔ نہ اس کے بعد ہی اس کے مقررہ معیار تک پہنچ سکے۔

ابھی ہمارے جدید دور تک دوسرے نظاموں کے زیر سایہ زندگی گزارنے والے بہت سے لوگوں کے لیے وہ حقائق تمناؤں کا درجہ رکھتے رہے ہیں جنہیں اسلام بہت پہلے پیش کر چکا ہے۔

جب اسلام آیا تو حکمراں لوگ سمجھتے تھے کہ وہ کسی دوسری مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور عوام پر ان کی حکمرانی ان کا خدائی حق ہے۔

اسلام نے اس زغم باطل کو ٹھکراتے ہوئے اپنے نبی کی زبانی لوگوں سے یہ کہلوایا کہ:

إِنَّمَا أَنْتَ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ - میں تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہی ہوں۔

(العنکبوت - ۱۰۰)

آپ کے بعد آپ کے خلفاء آزادانہ طور پر چنے گئے۔

پھر حکمراں نے یہ اصول بھی صاف صاف بتائے کہ:

”میں تمہارا والی بنایا گیا ہوں لیکن تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں“

اور یہ کہ ”اگر تم مجھ سے بھلائی صادر ہوتے دیکھو تو میری مدد کرو اور اگر بُرائی

صادر ہوتے دیکھو تو مجھے سیدھا کرو“

اس طرح صاف اور روشن ہدایات کے ذریعہ پہلے کے بادشاہوں کا تقدس

پارہ پارہ ہو گیا اور خداداد حق کے نظریہ کی بنیاد پر کسی شخص کے بادشاہ بن کر سلطنت ہونے

کا بھرم ٹوٹ گیا۔

انسانی معاشروں میں شریف و رذیل یا آقا و عسلا م جیسی غیر منصفانہ تقسیم کو

اسلام ظالمانہ قرار دیتا ہے اور فطری طور پر اس کا مخالف ہے۔

مکہ مکرمہ کے دور میں اس کے اس اصول کی سخت آزمائش بھی ہو چکی ہے۔ طاقت و

اقتدار والے لوگ اسلام میں کمزور طبقہ کے لوگوں کے داخل ہونے سے پریشان تھے اور آئندہ کے لیے خوف محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ ان لوگوں کو اپنے پاس سے بھگا دیجیے تو ہم آپ کا دین قبول کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیشکش کو بے چوں و چرا مسترد کر دیا۔ دوبارہ پیغام آیا کہ اگر ان لوگوں کو ساتھ رکھنا ہی ہے تو پھر انھیں کچلی صفوں میں کر دیا جائے اور ہم لوگ اگلی صفوں میں رہیں۔

جبکہ آگے تو باصلاحیت اور ایمان و عمل میں سبقت کرنے والوں کا حق تھا ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پیشکش پر غور کر رہے تھے کہ کیا اہل ایمان کو ان کے ایمان پر بھروسہ کرتے ہوئے کچھ دنوں کے لیے پیچھے کر دیا جائے اور ان طاقتور لوگوں کو آگے قبول کر لیا جائے یہاں تک کہ جب ان کے دلوں میں ایمان پوری طرح پختہ ہو جائے تب یہ خود اپنا مغزورانہ انداز چھوڑ دیں گے۔

اتنے میں وحی نازل ہوئی کہ:

اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انھیں اپنے سے دور نہ پھینکو ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں اس پر بھی اگر تم انھیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہوگا۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُودُ عَلَيْهِمْ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَكُودُهُمْ فَتَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ

الانعام ۵۲-۵۳

اس طرح آہ انی ہدایت نے فیصلہ کر دیا کہ اصولوں کو — محض ظاہری طور پر بھی — قربان نہیں کیا جاسکتا جو اسلام میں داخل ہو وہ جاہلانہ خیالات کی چادر اتار پھینکے اور یہ نہ سمجھے کہ وہ موہوم نام نہاد خیالی امتیازات کی بنا پر کسی دوسرے سے افضل ہے۔

○ مساوات کے تعلق سے عورت کے بارے میں بھی اسلام کے موقف کی وضاحت ضروری ہے۔

کیا یہ صحیح ہے کہ اسلام نے مرد کے مقابلے میں عورت کو کم مرتبہ دیا ہے؟ جو لوگ اس طرح کی بات کرتے ہیں ان کی دلیل یہی ہوتی ہے کہ اسلام نے میراث میں مرد کا حصہ عورت سے زگنار رکھا ہے اور عورت کی گواہی اس کے نصف قرار دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں مغالطہ ہے

اگر اسلام نے میراث میں عورت کا حصہ مرد سے نصف نہ مقرر کیا ہوتا تو مساوات کا توازن ہی بگڑ جاتا اور عورت کا حصہ زیادہ ہو جاتا۔

اور یہ اس لیے کہ اسلام نے مرد ہی پر عورت کے اخراجات کی ذمہ داری ڈالی ہے وہی شادی کی صورت میں اسے مہر بھی ادا کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو ذمے داریاں مرد پر ڈالی گئی ہیں ان کی ادائیگی میں اس کا مال تو ختم ہو جائے جبکہ عورت کا مال اسی طرح برقرار رہے گا اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اسی صورت حال کے پیش نظر میراث میں مرد کا حصہ بڑھا دیا گیا ہے۔ اور یہ ایسا صرف مادی ذمے داریوں کے پیش نظر ہے اس سے مرد کی کوئی معنوی فضیلت ہرگز مستقیم نہیں۔

رہا گواہی کا معاملہ۔ تو یہ بالکل واضح ہے کہ اسلام نے عورت کا زیادہ تر کردار گھر کے اندر سے متعلق اور کم تر زندگی کے دوسرے میدانوں سے رکھا ہے اور اس طرح اسے ان ذمے داریوں کی ادائیگی کے لیے موقع فراہم کیا ہے جن کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے

اور جو اس کی امتیازی خصوصیات سے مناسبت رکھتی ہیں۔ جیسے ماں بننا، بچوں کی تربیت و پرورش وغیرہ۔ اور یہ انسانی معاشرہ کا وہ اہم پہلو ہے جسے عورت کے علاوہ کوئی اور بحسن و خوبی پورا نہیں کر سکتا۔ (اور گواہی کا تعلق زیادہ تر گھر کے باہر کے امور سے متعلق ہے) بس اس کے علاوہ مرد و عورت دونوں ہی ایک پیڑ کی شاخ ہیں۔

جواب میں ان کے رب نے فرمایا ہیں تم
میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں
خواہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے
کے ہم جنس ہو۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا
أضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ
أَوْ أُنْثَىٰ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ
(آل عمران - ۱۹۵)

حقوق

لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کے واقعات شروع ہی سے ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ جیسے ہی کوئی شخص اپنے آپ کو زیادہ طاقتور محسوس کرتا ہے ویسے ہی دوسرے لوگوں کو اپنی خواہش کے مطابق چلانے پر مجبور کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جب انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مادی یا معنوی اعتبار سے دوسروں سے فائق ہے، اور ذہن و کردار کی پختگی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی، تو وہ غرور و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔

دولت کے غرور اور جاگیر دارانہ و سرمایہ دارانہ ذہنیت کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے رب کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَّاظٍ
إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ -

(العلق ۶-۸)

مصر نامہ دولت والا معاشرہ دوسروں کو حقیر سمجھنے اور ان کی برائیاں ڈھونڈنے لگتا ہے اس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے جس نے مال جمع کیا اور اسے

وَيْدٌ يَّكُلُ هُمْزَةً لِّمَنْزِلِ الَّذِي
جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ
أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ

(الحطمة - ۱-۲) گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔

اقتدار کا غرور بھی دولت کے غرور جیسا ہی ہوتا ہے اور وہ بھی دوسروں کو ان کی مرضی کے مطابق چلنے دینے کے بجائے خود اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کرتا ہے۔

آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے" تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ "ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے"

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوْدَنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَنَآوِحِيْ اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِيْنَ وَلَنُسَكِنَنَّكُمْ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ۔

(ابراہیم ۱۳-۱۴)

یہی اقتدار کا نشہ و غرور لوگوں میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ دوسرے لوگ ان کے اشاروں پر ناچنے لگیں۔

لیکن کسی انسان کو یہ اقتدار آخر کیسے حاصل ہو گیا اور وہ کس طرح لوگوں کا آقا و مالک بن گیا؟

اس طرح کے شیکنوں سے انسان کو آزاد کرانا بہت بڑی بھلائی ہے۔ اور ان بیرونی کو توڑ کر ہی دولت و اقتدار کے غرور و نشہ کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے اور تمام بندگانِ خدا کی ضرورتیں پوری کی جاسکتی ہیں اور ان کی انسانی عزت و مرتبت بحال کی جاسکتی ہے۔



انسانی تاریخ میں ظلم و زیادتی کے بہت سے الم ناک واقعات نظر آتے ہیں یہاں تک کہ بہت سے قنوطیت پسند و انشوریہ کہہ اٹھے کہ ظلم انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اب چاہے ظلم کا رجحان انسان میں طبعی طور پر ہو یا دولت کی غلط تقسیم اور اہل اقتدار پر عام نیگانی کی کمزوری کی وجہ سے ہو، بہر حال ظلم بہت بُری چیز ہے۔

انسانیت نے ظلم و زیادتی کے شکنجوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے بڑی طویل جدوجہد کی ہے خود اسلام ظلم کا مقابلہ دو طرح سے کرتا ہے۔

۱۔ ظلم کے خلاف ڈٹ جانے، اس کی مزاحمت کرنے اور ظالموں کے سامنے پُرا انداز نہ ہونے پر اُبھار کر۔

۲۔ ظالموں کو ڈرا دھمکا کر، تاکہ ان سے ظلم سرزد نہ ہونے پائے، کیونکہ ظلم سے زندگی تاریک ہو جاتی ہے اور لوگوں کے دل تنگ ہو جاتے ہیں۔

اسلام ان دونوں صورتوں کو ظلم قرار دیتا ہے کہ کوئی شخص دوسرے شخص پر زیادتی کرے یا کوئی شخص اس زیادتی کو برداشت کرے۔

دین و دنیا دونوں میں ظلم کو برداشت کرنے کی گراوٹ قبول کرنے والا ظالم ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ
ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَا كُنْتُمْ
مَا لَوْ كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ -

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی
روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان
سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟
انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و
مجبور تھے۔

(النساء - ۹۷)

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ
لڑیں جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا
گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا
کر دیے گئے ہیں مگر جب ان کو جنگ کا
حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ
سب پیٹھ موڑ گئے اور اللہ ان میں سے
ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

وَمَا لَنَا أَنْ لَا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَقَدْ أَخْرَجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا
فَلَمَّا كَتَبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالَ
تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ
عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ -

(البقرہ ۲۳۶)

ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم
کی لپٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا
فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ
دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءٍ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ -

ولی دوسرے پرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں
بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہیں پہنچے گی۔

ان آیات میں زیادتی کو دور کرنے پر زور دیا گیا ہے اور اسے قبول کرنا ظلم قرار
دیا گیا ہے۔ اس لیے ظلم پر خاموشی اختیار کرنا اور ظالموں کی ہاں میں ہاں ملانا جائز نہیں
ورنہ ایسا کرنے والا شخص ذلیل ہونے کے ساتھ ساتھ خود ظالم ہوگا۔

اب رہے وہ لوگ جو دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں ان کے بارے میں قرآن کریم

کہتا ہے:

اب یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کو تم
اس سے غافل نہ سمجھو اللہ تو انہیں ٹال رہا
ہے اس دن کے لیے جب حال یہ ہوگا کہ
آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئی ہیں۔

یقیناً ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے

اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے
تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔
فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک
ہوتی ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ
الظَّالِمُونَ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ
تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ

(ابراہیم - ۲۲)

إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ
عَظِيمٌ (الشوریٰ - ۲۱)

وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ
الْقُرْيَةَ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ
إِلَيْكُمْ شَدِيدٌ

(ہود - ۱۰۲)

اظہارِ رائے کی آزادی

ظالموں کے ساتھ کشمکش کے سلسلے میں دنیا کو بہت سے تجربات حاصل ہوئے ہیں جنہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔

ظالم و سرکش لوگوں کو اسی وقت چین آتا ہے جب وہ دوسروں کے منہ بند کر دیں اور اپنے خلاف کوئی بات سُننے بغیر آگے بڑھتے رہیں۔

بات کرنے کی آزادی، جسے ظالم حکمراں ناپسند کرتے ہیں، لغو اور تفریحی باتوں یا بذلہ سنجیوں اور گانوں وغیرہ سے متعلق نہیں، بلکہ اس طرح کی باتیں تو وہ پسند کرتے ہیں اور انہیں اپنی راہ کی رکاوٹ نہیں سمجھتے۔

بات کرنے کی وہ آزادی جس کے علم بردار اصلاح پسند ہوتے ہیں اور جسے سرکش سخت ناپسند کرتے ہیں وہ تعمیری تنقید، نصیحت و اصلاح اور ڈنڈے اور تلوار کے بجائے دلیل کے مقابلے میں دلیل پیش کرنے کی آزادی ہے۔

اسلام اس آزادی کی تفصیل اور اس کے بارے میں اپنا موقف بالکل واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ تنقید و نصیحت کی آزادی کو ایسا نہیں سمجھتا کہ وہ ہر انسان کے لیے جائز ہے جب چاہے اختیار کرے اور جب چاہے چھوڑ دے۔ بلکہ معاملہ اس سے بہت زیادہ اہم ہے۔

اس طرح کے موقع پر بات کہنا جائز نہیں واجب ہے۔

یہ مسلمان پر فرض ہے کہ وہ غلطی کو خاموشی سے نہ ہونے دے۔ بلکہ اس کو ردِ مقام

ناگزیر ہے۔

غلطی پر تنقید اور غلط کاروں کو نصیحت کرنا واجب ہے۔

پورے معاشرے پر یہ وقتے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ یہ ڈیوٹی انجام دے کسی غرض کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے کہ حق کو زندہ و باقی رہنا چاہیے اور درست کو ظاہر و معلوم ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْعَصْرَانَ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا
بِالسَّحْقِ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسار میں
ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور
نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے
کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

(العصر - ۱ - ۳)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:

الدِّينُ النَّصِيحَةُ (بخاری) دین خیر خواہی کا نام ہے۔

اس ٹھوس بنیاد پر بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی ذمے داری قائم ہے
اور یہی امت اسلامیہ کی امتیازی خصوصیت ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر اسے بہترین
امت کا درجہ حاصل ہوا۔

حق بات یقین کے سرچشمے سے نکلتی ہے۔ اگر مسلمان کے دل میں یقین کا سمندر موجیں
لے رہا ہے تو وہ ہر موقع پر ضروری بات کہے گا۔ ہدایت یا ممانعت کی شکل میں اور نصیحت
و تنقید کی شکل میں۔

اور یہ یقین جتنا کمزور ہوگا اسی قدر اس کی آواز کمزور ہوگی یہاں تک کہ اس کی
سرگوشی بھی سناؤ شوار ہو جائے گا۔ تاہم مسلمان کے دل میں حق کے لیے جیت مر نہیں سکتی۔
حالات اسے خاموش کر سکتے ہیں لیکن اس کے دل میں بہر حال اس کی حقیقت جاگزیں
رہے گی۔

یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا مطلب ہے کہ:

”تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دے، اور اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روک لے، اور اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو اپنے دل سے (اسے برا سمجھے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے“ (بخاری)

یہ تو اظہار رائے کی آزادی کا ایک پہلو ہوا۔

اب رہا دوسرا پہلو۔ یعنی یہ کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جو چاہے کہے یا لکھے۔ تو اس کے بارے میں اسلام کی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔

وہ بے مقصد باتیں بنانے کو پسند نہیں کرتا کیونکہ اس سے مفید اور سنجیدہ چیزوں سے لوگوں کی توجہ ہٹتی ہے۔

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلائی بات ہے۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ
إِلَّا مَنَ أَمْرٌ بَصِيْقَةٌ أَوْ مَعْرُوفٌ
أَوْ إِصْلَاحٌ بَيْنَ النَّاسِ۔

(النساء ۱۳۳)

اور اگر بات کسی کی برائی اور بدگونی پر مشتمل ہو تو اس کی اجازت نہیں اور کسی شخص کو بھی اس کی آزادی اور حق حاصل نہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہیں، بلکہ شکی اور تقویٰ کی باتیں کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ
فَلَا تَنَاجُوا بِالْأَسْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ
الرَّسُولِ وَتَنَاجُوا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ۔

(المجادلہ۔ ۹)

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی برائی پر زبان کھولے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ
إِلَّا مَن ظَلَمَ۔ (النساء ۱۳۸)

افسوس ناک بات یہ ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کا مطلب بہت سے قلم کاروں نے بالکل الٹا سمجھ لیا ہے اور صفحے پر صفحے لالبعنی، بیہودہ اور نقصان دہ باتوں سے سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ گویا شیطان ان کے دماغوں میں گھر بنا چکا ہے اور ان کے قلموں کے ذریعہ سانس لے رہا ہے اب ان سے جنلی، غیبت، تجسس، بے حرمتی، شہوت پرستی اور رسوا کن چیزیں ہی نکلتی ہیں جو اسلام نے ممنوع قرار دے رکھی ہیں۔ دوسری طرف انھیں پڑھ پڑھ کر لوگوں کا رجحان سنجیدگی کے بجائے تفریحات اور برائیوں کی طرف بڑھ رہا ہے اور حق پرستی اور اخلاق و کردار نگاہوں سے اوجھل ہو رہے ہیں۔

تعبیر کی اس قسم کو اظہار رائے کی آزادی نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ یہ تو برائی اور تخریب کی آزادی ہے اور تمام ہی قوموں کو اس کے انجام سے ڈرنا چاہیے۔

اعتقاد کی آزادی

اعتقاد کی آزادی کا فیصلہ کرتے ہیں دنیا بڑی مشتتیں پھیل چکی ہے اور اس سلسلہ میں کتنی شدید معرکہ آرائی ہو چکی ہے اس کا ہم مسلمانوں کو احساس بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اعتقاد کی آزادی ایک واضح حقیقت کے روپ میں ہمیں اپنے دین کی تعلیمات سے بھی ملی ہے اور ہمارے اسلاف کی روایات سے بھی۔

اسلام اس بات کو قطعی مسترد کرتا ہے کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے وہ صرف اس بات کا قائل ہے کہ اس کے طریق کار کی تشریح کر دی جائے اور اس کی کتاب پڑھ دی جائے اور لوگوں کو مکمل طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اپنی مرضی سے چاہیں تو اسے قبول کر لیں اور نہ چاہیں تو نہ قبول کریں۔

اور اے نبی! تمہیں ہم نے اس کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے اسے) بشارت دو اور (جو نہ مانے اسے) متنبہ کر دو۔ اور اس قرآن کو ہم نے تصور اٹھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کو سناؤ اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے۔ اے نبی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم اسے مانو یا نہ مانو۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا
وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى
النَّاسِ عَلَىٰ مَكْتَبٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا
قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لَا تُؤْمِنُوا

(بنی اسرائیل ۱۰۵-۱۰۶)

جی ہاں آپ چاہیں تو ایمان لائیں۔

یا چاہیں تو انکار پر برقرار رہیں۔

آپ کو جو چیز پسند نہیں اسے اپنانے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔

مطلوبہ ایمان کا واحد راستہ آزادانہ جانکاری، دل کا مکمل اطمینان اور صدق و اخلاص کے بھرپور جذبہ کے ساتھ قبول کرنا ہے۔

اسی لیے مذکورہ آیت کے بعد قرآن کریم کہتا ہے:

جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا انہیں جب یہ مستایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں ”پاک ہے ہمارا رب اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا“ اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خنوع اور برطھ جاتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ
إِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْآذَانِ
سَجْدًا أَوْ يَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا
إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعًا وَ
يَخِرُّونَ لِلْآذَانِ يَبْكُونَ وَ
يَزِيدُهُمْ خُشُوعًا۔

(سفی اسرائیل - ۱۰۷ - ۱۰۹)

آپ نے دیکھا؟

اسلام نے ایک دن بھی زور زبردستی کی حمایت نہیں کی اور نہ کبھی کرے گا کیونکہ وہ ایک چیز۔ اپنی تعلیمات اور قوانین کی نفاست اور معیار پر یقین رکھتا ہے۔ وہ لوگوں سے صرف اتنا چاہتا ہے کہ عام بازار میں اسے پیش ہونے دیں تاکہ تلاش کرنے والی اور تنقیدی نگاہیں اس کا جائزہ لے سکیں۔

اگر کسی چیز کی کوالٹی اپنی طرف مائل نہیں کرتی تو نہ کوئی اس کی طرف متوجہ ہوگا نہ اسے قبول کرے گا یہی اسلام کے اس محکم قانون کا راز ہے۔

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت سے

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ
الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ
يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ

انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا اس نے
ایک ایسا مضبوط سہارا تمام لیا جو کبھی ٹوٹنے
والا نہیں اور اللہ سب کچھ مستثنیٰ اور جاننے
والا ہے۔

تَقِي اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى
لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ
(البقرہ ۲۵۶)

کبھی روئے زمین پر مختلف اسباب کی وجہ سے زندگی کی معرکہ آرائیوں میں اسلام کو
بھی گھسیٹ لیا جاتا ہے اور اسے ایسی جنگ لڑنی پڑتی ہے جس کے شعلے اس کے بھر کلاتے
ہوتے نہیں ہوتے۔

آپ کا کیا خیال ہے اگر اسلام اس طرح کی جنگ میں فتح یاب ہو جائے اور اپنے
مخالفین پر زور زبردستی کا موقع پا جائے تو کیا وہ انھیں عقیدہ توحید قبول کرنے پر
مجبور کرے گا؟

ہرگز نہیں... اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے فرماتا ہے:

دَانَ أَحَدٍ مِّنَ الشُّرَكِيِّينَ اسْتَجَارَكَ
فَأَجْرُهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ
ثُمَّ أَبْلِغُهُ مَا مَنَّهُ.
(التوبة - ۶)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ
مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ
کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک
کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے
مامن تک پہنچا دو۔

یہ نہیں فرمایا کہ جب وہ اللہ کا کلام سن لے تو اسے اپنا دین چھوڑ کر دین حق قبول
کرنے کا حکم دو۔

نہیں، بلکہ یہ حکم دیا کہ اسے آزاد چھوڑ دو اور حفاظت کے ساتھ اس کے وطن
پہنچا دو۔

اس کے بعد اگر وہ اسلام کے دائرے میں داخل ہونا چاہے تو وہ مجبوراً نہیں اپنی
مرضی سے خود آجائے گا۔

یہ چھوٹ کیوں؟ اس لیے کہ:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُوْنَ۔
یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

(التوبة - ۶)

اس لیے ضروری ہے کہ انہیں جانکاری حاصل کرنے کا پورا موقع دیا جائے جب وہ دین کو سمجھ لیں گے تو اسے قبول کر لیں گے۔

جس دور میں دینی جگیں دنیا کے مختلف حصوں میں رائج تھیں، لوگوں کی مرضی کو کوئی بھی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور جبر و تشدد کے ساتھ لوگوں کو کسی دین میں داخل کرنے کو قابل تحسین سمجھا جاتا تھا۔ ایسے دشوار گزار زمانہ میں لوگ اسلامی فقہ کی کتابوں میں اتنی آزادی کی بات پڑھ کر حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ لکھتے ہیں:

”آزادی اعتقاد کے تعلق سے اسلام کے اہتمام اور قدردانی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا بچہ کہیں مل جائے جس کے باپے میں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ مسلمان گھرانے کا ہے یا کافر خاندان کا، اور کوئی کافر یہ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے جب کہ ایک مسلمان یہ کہے کہ یہ میرا غلام ہے تو ایسی صورت میں فیصلہ بچے کی آزادی اور کافر خاندان کی فرزندگی ہی کا کیا جائے گا“

اور یہ اس لیے کہ ایسی صورت میں اسے فوراً آزادی مل جائے گی اور جب وہ بڑا ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ کے وجود کی معرفت اور اسلام کے بہترین دین ہونے کے علم کے بعد اسلام کی دولت بھی حاصل کر سکے گا۔

یہ قرون وسطیٰ کی اسلامی فقہ کی کتابوں کا حکم ہے۔

جدید تہذیب کے علم بردار اب کیا کہیں گے؟

گم شدہ بچوں، سادہ لوح اور معذور لوگوں کے عقائد کے سلسلے میں وہ کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں؟

اگر اسلام پر کوئی نکتہ چینی کی جاسکتی ہے تو طرح طرح کے فتنوں اور ظلم و زبردستی سے بھری ہوئی اس دنیا میں مثالی آزادی اعتقاد دینے ہی پر کی جاسکتی ہے۔

جب کہ اسلام کے پیروکار اس مذہبی تعصب کا شکار ہو کر شدید نقصان اٹھا رہے ہیں۔ تب بھی اسلام نے معاملات میں جیسے کوتیا والا فارمولا کبھی اپنی عام پالیسی کا حصہ نہیں بنایا نہ اپنی عطا کردہ وسیع آزادی اعتقاد میں کوئی کمی کرنا منظور کیا۔

اسپین کی سرزمین سے اسلام کے استیصال کے ردِ عمل کے طور پر جب عثمانی سلطان سلیم اول نے ایک بار یہ کوشش کرنی چاہی کہ مصر کے غیر مسلمین کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے تو شیخ الاسلام نے اسے مسترد کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ دوسرے لوگ چاہے جو کچھ کریں آزادی اعتقاد کے وسیع اسلامی طریق کار و نظریہ کو بدلا نہیں جاسکتا۔

اسلام تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ آزادی اعتقاد کے احترام اور اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات سے وفاداری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

مفلسی سے آزادی

فقر و فاقہ سے نجات انسان کا حق ہے۔ اور اس حق کا فیصلہ اس نے غربت و بے چارگی کی الم نایموں کی بنا پر کیا ہے۔

یہ انسان کا حق ہے کہ اسے ایسی ضمانتیں حاصل ہوں جو اسے اس طرح کی برائیوں سے بچا سکیں اور وہ ماضی سے سبق لے کر حال و مستقبل کا تحفظ کر سکے۔

کاش انسان مختلف قسم کی جانکاریاں حاصل کرنا جن سے اپنے تمام معاملات میں یقین کے درجے تک پہنچ سکتا۔

اسلام انسان کو اس ناپسندیدہ فقر و افلاس سے مختلف طریقوں سے آزاد کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو اسے اس کام کا موقع فراہم کرتا ہے جس کے لائق اسے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، کیونکہ یہ اس کی زندگی کی بنیاد، اس کے فائدوں کا سرچشمہ اور روئے زمین پر اس کی خلافت کے مرتبہ کو ظاہر و نمایاں کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس نے اس زمین کو اس لیے بنایا ہے کہ لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں اور اس میں وافر مقدار میں موجود مختلف خزانوں کو نکال کر ان سے بہرہ اندوز ہوں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ الْاَرْضَ بِسَاطًا
لِتَبْلُغُوا مِنْهَا سُبُلًا مُّجَاثًا۔
(نوح - ۱۹ - ۲۰)

اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی
طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں
میں چلو۔

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تالیح کر رکھا ہے چلو اس کی چھائی پر اور کھاؤ خدا کا رزق۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ ذُلُولًا
فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن

رِزْقِهِ (الملک - ۱۵)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تروتازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زمین کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو تم دیکھتے ہو کہ کبھی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِيَتَاكُلُوا
مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ
حَدِيدًا يُسَوِّنَهَا وَتَرَى الْفُلُكَ
مَوْاجِرِينَ وَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ

(النحل - ۱۲)

ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے سامانِ زلیت فراہم کیا مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا
لَكُمْ فِيهَا مَعَالِشَ

(الاعراف - ۱۰)

قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیتیں ہیں جو انسان کو اس کے وسیع اختیارات اور اس کے عظیم ورثہ کے سرچشموں سے باخبر کرتی ہیں۔ اب انسان اور تونگری کے درمیان آخر کو کنسی رکاوٹ درست ہو سکتی ہے؟

تونگری، طاقت اور اختیار کا اولین ذریعہ اور کنجی یہ ہے کہ لوگ رزق و برکت کی ان ساری چیزوں کو تصرف میں لائیں جو ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور جنہیں قدرت نے ان کے لیے فراہم کیا ہے۔

جو ان خزانوں سے آنکھیں بند کر لے یا ان سے فائدہ ہی نہ اٹھا سکے تو یقیناً فقر و فاقہ ہی اس کے حصے میں آئے گا۔

دولت کا راستہ انسان کی صلاحیتوں اور اس کا ننان کی فطرت کے درمیان تعلق پیدا کرنے سے شروع ہوتا ہے اور جب یہ تعلق قائم ہو جاتا ہے تو بھلائی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

یہ افراد کی بھی ذمے داری ہے اور جماعتوں کی بھی کہ وہ اس ناگزیر تعلق کو قائم کرنے میں باہم تعاون کریں۔

کسی کی یہ بات قبول نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے آپ کو فقیر سمجھے اور کوئی کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی دستِ سوال دراز کرے۔

یہ کتنی حیرت ناک بات ہوگی کہ ان معاشرہ میں جہاں کام کرنے والوں کی کمی ہے کوئی طانت رکھنے والا آدمی بھیک مانگے؟

لیکن کیا اس سے بھی زیادہ حیرت ناک بات یہ نہیں کہ مشرق کی پوری پوری قومیں دوسروں سے مدد مانگتی پھرتی ہیں جبکہ ان کے قدموں کے نیچے دولت کے خزانے بھرے پڑے ہیں جن سے غربت ختم کر کے خوشحالی حاصل کی جاسکتی ہے؟

لیکن ہمتوں کی پتی اور کردار کا بحران ہر چیز میں افلاس اور المیہ تک لے جاتے ہیں۔

اسلام کا ہلی اور کم عقلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اس غربت کو قابلِ حقارت اور اس طرح کی صورت میں بھیک مانگنے کو جرم قرار دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ان احادیث پر غور کیجئے تو آپ کو خود یقین آجائے گا:

”اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (مانگنے والے) ہاتھ سے بہتر ہے“ (بخاری)
 ”ہاتھ تین قسم کے ہیں سب سے بلند ہاتھ اللہ تعالیٰ کا ہے اس کے بعد دینے والے ہاتھ کا مرتبہ ہے اور مانگنے والے کا ہاتھ قیامت کے دن تک نیچا ہے گا اس لیے جہانگ ہو سکے مانگنے سے بچو“ (حاکم)

”تم میں سے کوئی شخص مانگتا رہا تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے چہرے پر کچھ بھی گوشت نہیں ہوگا“ (بخاری)

”جس نے کوئی چیز مانگی جبکہ اس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا تو وہ چیز قیامت کے دن اس کے چہرے پر ہوگی“ (احمد)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور صدقہ مانگا۔ آپ نے فرمایا: کیا تمہارے گھر میں کوئی چیز نہیں؟ اُس نے کہا: ایک چادر ہے جسے ہم اوڑھ لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ۔

وہ دونوں چیزیں لے آئے تو آپ نے انھیں ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ: ان چیزوں کو کون خریدتا ہے؟

ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہؐ میں ایک درہم میں لے لوں گا۔ آپ نے فرمایا: ایک درہم سے زیادہ کون دیتا ہے؟ (آپ نے دو تین بار دہرایا) ایک شخص نے کہا: میں دو درہم میں لے لوں گا۔

آپ نے اس سے وہ درہم لے کر انصاری کو دیے اور فرمایا: ایک درہم سے کھانے کی چیزیں خرید کر گھر والوں کو پہنچا دو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔

انصاری کلہاڑی لے کر آئے تو آپ نے خود اپنے دستِ مبارک سے اس میں دست لگایا اور فرمایا جاؤ لکڑیاں کاٹ کر بچوں میں پندرہ روز تک نہیں نہ دیکھوں۔ انصاری کے پاس کچھ بھی نہیں تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر کا وہ معمولی سا مان نیلام کر کے اس کی قیمت سے کلہاڑی لے کر رزق کمانے کا ذریعہ بنایا اور مانگنے کی اجازت نہیں دی۔

اور پھر آپ نے فرمایا: ”یہ اس سے بہتر ہے کہ بھیک مانگو کہ قیامت کے دن تمہارے چہرے پر بد نما داغ بن جائے“

بھیک مانگنے کی اجازت صرف ایسے شخص کو ہے جو انتہائی فقر و فاقہ کا شکار ہو اور اسے دور کرنے کا کوئی اور راستہ نہ پاسکے یا پھر قرض کے بوجھ نے اس کی کمر توڑ رکھی ہو یا پھر خوں بہا کی ادائیگی میں بے بس ہو چکا ہو (ابوداؤد)

اب سوچئے ان قوموں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کیا ہوگا جو ایسے علاقوں میں آباد ہیں جہاں بہترین خزانے دفن ہیں لیکن وہ انہیں نکال کر فائدہ اٹھانے کے بجائے یہاں وہاں مدد کی بھیج مانگتی پھرتی ہیں؟

غربت سے نجات سب سے پہلے فطری وسائل کے ساتھ انسانی جدوجہد کو جوڑنے پر منحصر ہوتی ہے۔

اور مختلف کاموں کے ذریعہ مال و دولت کمانا لوگوں کے اخلاق و کردار، ان کے عام تعلقات، ان کے سماجی روابط اور ان کے سیاسی حالات پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

اقتصادی حالات کے جوہم نفسیاتی نتائج نکلتے ہیں انہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام چونکہ انسان کی گہرائیوں کے ساتھ ربط رکھتا ہے اس لیے وہ زندگی کے معاملات میں پوری طرح دخل دیتا ہے۔

تب وہ انسان کے سب سے اہم مسئلہ، اس کے بدن کی سب سے شدید ضرورت اور اس کی روح کی گہرائیوں تک اثر انداز ہونے والے معاملہ سے غافل رہ سکتا ہے؟

اس لیے اسلام ایسے قواعد و ضوابط دیتا ہے جن سے اس کی اقتصادی پالیسی واضح ہو، اور وہ دائرہ روشن ہو کر سامنے آئے جس کے حدود میں انسان کو زندگی گزارنی چاہیے۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی معیشت کا مقصد ایسا مثالی معاشرہ قائم کرنا ہے جس سے ساری دنیا کو فائدہ پہنچے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دولت کا ایک بلند سماجی کردار ہے جسے ہرگز اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا، کسی کو بھی اس کے اس کردار کو مسخ کرنے اور اس کے عام فائدہ کو روکنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ مندرجہ ذیل نظریات اور اصولوں کی روشنی میں حالات کو استوار کرے۔

۱۔ دولت میں اس فرد سے پہلے جس نے اسے کمایا ہو، اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور

اجتماعی ادارہ ہی اس اعلیٰ حق کے تصرف کی نمائندگی کرتا ہے اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ:

وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مِنْتُمْ مَخْلُفِينَ
فِيهِ - (الحديد - ۷)

اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر
اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔
اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے
آپ کو عطا کیا۔ (النور - ۳۳)

۲۔ معاشرے کے کسی ایک گوشہ میں دولت کا اتکا جائز نہیں کیونکہ اس سے سماجی و
اخلاقی توازن میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

جبکہ عام توازن کو برقرار رکھنا چاہیے۔

یہی دولت کو گردش میں رکھنے کا اصول ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ماخوذ

ہے۔

كَيْلًا يَكُونُ دَوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ
مِنْكُمْ - (الحشر - ۷)

تاکہ وہ تمہارے مالداروں کے درمیان ہی نہ
گردش کرتی رہے۔
۳۔ اخوت ایک سماجی نظام ہے جسے شدید فرق کو نمودار ہونے کی اجازت نہیں دی
جاسکتی جو ایک قوم کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دے اور اخوت ایک حقیقت ہے جسے
محض خواب و خیال بن کر رہ جائے۔ اس طرح کے فرق کی طرف بے جانے والے ہر مالی
تفاوت کی روک تھام کی جائے گی۔

۴۔ کام ہی کمانی اور ترقی کی بنیاد ہے۔ اگر ایسے حالات محدود ہوں جن میں ایک شخص
بغیر ظاہری جدوجہد کے کھائے۔ مثلاً بعض صورتوں میں وراثت سے حاصل شدہ
دولت کی وجہ سے۔ تو اس طرح کی خاص صورت کو معاشرے میں عام ہونے کی
اجازت نہیں دی جاسکتی تاکہ کچھ لوگوں میں بے روزگاری کا مستقل چلن نہ ہو جائے۔

وَيَكُلُّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا أُولَئِكَ فِيهِمْ
أَعْمَالُهُمْ وَهُمْ لَا يظَلَمُونَ -

ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ
سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ

(الاحقاف - ۱۹) ان کو دے ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔

اور حدیث میں آتا ہے:

مَنْ أَبْطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يَسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ (مسلم)
جس کا عمل سست گام ہو اس کا نسب اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔

۵۔ حلال کمائی ہی احترام اور برقرار رہنے کے لائق ہے جو حلال نہیں اسے اس کے اصل مالکوں کے لیے یا غیر معمولی حالات میں معاشرے کے لیے ضبط کر لیا جانا چاہیے۔
۶۔ سو ممنوع ہے، ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے اور مشکوک استحصال ممنوع ہے۔
۷۔ قابل کاشت زمین کے تعلق سے اصول یہ ہے کہ ناجائز طریقے سے اس کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ جو اسے کاشت کرے گا اسی کے پاس برقرار رہے گی جو اسے بیکار چھوڑ دے گا اس کے پاس نہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ:

”بندے خدا کے بندے ہیں اور ملک خدا کے ملک ہیں“ (ابوداؤد)

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ
مِنْ عِبَادِهِ - (الاعراف - ۱۲۸)
زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

زمین کی وراثت یا ملکیت اسی کے لیے ہونی ہے جو اسے آباد کرے اور قوم کو اس کے پھل سے فائدہ پہنچائے۔ ایسا کرنے والا ہی بیکار بیٹھنے والوں کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہے۔
۸۔ اسلام نام ہے کچھ مخصوص فضیلت کی چیزیں حاصل کرنے اور کچھ متعین قابل حقارت چیزوں کو چھوڑنے کا۔ اب جو مادی وسائل بھی فضیلت کی ان چیزوں کے حصول اور قابل حقارت چیزوں کے چھوڑنے میں معاون ہوں ریاست پر ان کی فراہمی کی ذمہ داری ہے اور معاشرہ انھیں آسان بنانے کا ذمہ دار ہے۔

۹۔ اسلام کا ایک متعین بلند مقصد اور پیغام ہے۔ اس پیغام کی ادائیگی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ریاست عام اقتصادی حالت کی نگرانی کرے یا کم از کم اقتصادی وسائل کی فراہمی اور ان کے ثمرات کے سلسلے میں اس طرح کے اقدامات کرے جو اس پیغام کی ادائیگی کی ضمانت

دے سکیں۔

غالباً ان اصولوں سے ان بنیادی خطوط کی نشاندہی ہوگئی ہوگی جو اسلام نے قوم کی مالی حالت کے تعلق سے پیش کیے ہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اسلام نے سب سے پہلے کس طرح کمانے اور رزق کے حصول کی جدوجہد پر زور دیا ہے۔

پھر اقتصادی میدان میں انسانی سرگرمیوں پر کس طرح نگرانی قائم کی تاکہ حق کا تحفظ ہو سکے اور باطل کا لحدم ہو جائے۔

ان سب کے باوجود بھی کچھ لوگ لاچاری کا شکار ہو سکتے ہیں۔

دنیا میں کوئی ایسا خود کار نظام نہیں پایا جاتا جو جنگ یا امن کے زمانے میں کم یا زیادہ انسانوں کو پریشان حالی کا شکار ہونے سے روک سکے۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام امکانی شکافوں کو بند کرتا ہے اور طاقت و صلاحیت رکھنے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ معذوروں کو تھام لیں اور انہیں کم سے کم اتنا خرچ ضرور فراہم کریں جس سے ان کی تکلیف کا سدباب ہو جائے۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ
كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔
(البقرہ ۲۱۹ - ۲۲۰)

وہ پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں کہو
جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ (عفو) ہو اس
طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان
کرتا ہے شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر
کرو۔

اور یہ ”عفو“ کیا چیز ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو آدمی اور اس کے خاندان کے ضروری خرچ سے زیادہ ہو۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد بہترین اور حلال ترین مال ہے۔
بہر حال دونوں صورتوں میں مقصد ضرورت مندوں کو اتنی مدد پہنچانا ہے جس سے
ان کی حالت درست ہو جائے اور وہ بھی پاک مال سے نہ کہ گری پڑی اور بیکار چیزوں سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

”جس کے پاس سواری زیادہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس سواری نہ ہو جس کے پاس زادِ سفر زیادہ ہو وہ اسے دے جس کے پاس زادِ سفر نہ ہو“ (مسلم)

حدیث کے راوی حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف قسموں کا نام لیتے رہے یہاں تک کہ ہم نے یہ خیال کیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں ہے۔

قرآن کریم میں انفاق (خرچ کرنے) کی آیتیں ستر سے زیادہ ہیں جن سے خرچ اور سخاوت کا لامتناہی احساس پیدا ہوتا ہے۔

اسلام جہاں اس انفاق کے ساتھ ضرورت مند پر رحم اور کمزور کے ساتھ نیکی کے پہلو کو اُبھارتا ہے وہیں خرچ کرنے والوں کو یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ اس خرچ کا پھل ٹوٹ کر خود انھیں کو ملے گا۔

اور راہِ خیر میں جو مال تم لوگ خرچ کرتے ہو
وہ تمہارے اپنے لیے بھلا ہے۔
جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی
سے بخل کر رہا ہے۔

وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسِكُمْ
(البقرہ - ۲۸۲)

وَمَنْ يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلْ عَن
نَفْسِهِ۔ (محمد - ۳۸)

اور یہ بدلہ آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملے گا۔

اور وہ اس طرح کہ معاشرے میں باہم محبت و شفقت اور ہم آہنگی پیدا ہوگی اور حد اور دشمنی کے جذبات ختم ہو جائیں گے۔ اور یہ ایسی بھلائی ہے جس کے سایے میں غریبوں سے پہلے دولت مند ہی چین لیں گے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دین لوگوں کے ذہن ماؤف کرنے والا نشہ ہے ان کے لیے ہم یہاں مشہور فقیہ ابن حزم کا فتویٰ نقل کریں گے:

ضرورت مند مسلمان اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے لڑے گا اور جب تک کسی بھی مسلمان کے پاس اس کی اپنی ضرورت سے زیادہ کھانا موجود ہے۔ ضرورت مند مسلمان

کے لیے مردار کھانا مباح نہیں۔ اب اگر لڑتے ہوئے ضرورت مند مسلمان قتل ہو گیا تو خون بہا اور قصاص اس کے قاتل سے لیا جائے گا اور اگر روکنے والا قتل ہو گیا تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی کیوں کہ وہ ایک حق کو روک رہا تھا اور اس کی حیثیت باغی گروہ جیسی ہوگی کہ:

فَإِنْ بَغْتُمْ أَحَدًا هُمْ أَعْلَى الْأَنْحَرِي
 تَفَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى
 وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

(الحجرات - ۹)

اور حق کو روکنے والا اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کا مجرم تھا۔
 کیا اسلام کی پیش کردہ ان ضمانتوں سے بڑھ کر بھی فقر و فاقہ سے نجات دلانے والی
 کوئی دوسری ضمانت پائی جاتی ہے؟

خوف سے آزادی

خوف سے آزادی ہمیشہ سے انسان کی تمنا ہی ہے لیکن اس حق کا مطالبہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سامنے آیا اس کے بعد یہ ان بنیادوں میں شامل ہو گیا جن پر اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

ظاہر ہے یہ ایک شریفانہ نظر یہ ہے۔

آخر روئے زمین کے مختلف گوشوں میں امن و سکون کا دور دورہ کیوں نہ ہو؟
بین الاقوامی تعلقات میں دھکی، جارحیت اور دہشت گردی کا ازالہ کیوں نہ ہو؟
جب ہر فرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے شہر میں دن میں آزادانہ گھومے پھرے اور رات میں سکون کے ساتھ اپنے گھر میں آرام کر سکے، اسے نہ ہتھیار لے کر چلنے کی ضرورت پڑے اور نہ کسی حملے کا ڈر ہو۔ ریاست کی بیداری اور قانون کی بالادستی ہر جگہ امن و امان کے تحفظ کی ضامن ہو۔ تو پوری دنیا میں ایسا ہی ماحول کیوں نہ ہو کہ کوئی قوم دوسری قوم کی جارحیت سے خائف نہ ہو، نہ کوئی کمزور ملک کسی طاقتور ملک سے ہراساں رہے اور نہ کوئی سیاہ فام نسل سفید فام نسل سے ڈرے۔

بلاشبہ یہ ایک حسین خواب ہے۔

کاش انسانی معاشرہ اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے باہم تعاون کرتا اور پھر اس کی ٹھنڈی چھاؤں سے نطف اندوز ہوتا۔

اسلام ہی چاہتا ہے کہ روئے زمین پر اس طرح کا امن و استحکام قائم ہو۔

لیکن کیا بدتماش لوگوں کی مجرمانہ ذہنیت ختم ہو سکتی ہے اور کیا ہزاروں لوگ گناہ اور جارحیت کے سلسلے میں تعاون کرنے سے شرمانے لگیں گے؟

بہر حال خوف سے آزادی اسلام کا ایک بنیادی مقصد ہے۔

اعتماد اور مفاہمت کی فضا ہی میں یہ دین پر وان چڑھ سکتا ہے اور یہی فضا وہ دوسروں کے لیے بھٹی فراہم کرنا چاہتا ہے چاہے اصولی و نظریاتی طور پر ان سے کتنا ہی اختلاف اور دوری کیوں نہ ہو۔

اسلام ذہن و اختیار پر دباؤ ڈالنے کو مسترد کرتا ہے کیونکہ وہ ایمان کی بنیاد مکمل ٹکری آزادی پر قائم کرتا ہے وہ انسان کے دماغ میں یقین پیدا کرنے کے سلسلے میں عقل کی صلاحیتوں کو دبانے کے لیے غیر معمولی خرق عادت چیزوں کا سہارا نہیں دیتا۔ جب مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور رسالت کی تصدیق کے لیے ذرا معجزے کا مطالبہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔ ان لوگوں کے پاس رحمن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اب کہ یہ جھٹلا چکے ہیں عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت (مختلف طریقوں سے) معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں یقیناً اس میں ایک نشانی ہے۔

إِنْ نَشَاءُ نُنزِلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَافُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنَ الرَّحْمَنِ مُحَدَّثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْتَهُ مُخْرِضِينَ فَقَدْ كَذَّبُوا فَيَأْتِيهِمْ أَنْبَاءٌ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ ابْتُنِيفِهَا مِنْ قَبْلِ زَوْجِ كَرِيمٍ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً

(الشعراء ۳ - ۸)

کائنات کی نشانیوں پر غور و فکر سے ہی سچا ایمان تشکیل پاتا ہے۔

جو اپنی عقل کا احترام کرتا ہو اسے ایمان کے لیے خرقِ عادت چیزوں کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

یہ عقلی ایمان کے بارے میں مسلمانوں کے احترام ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اس پر بحث کرنے لگے کہ کیا روایتی طور پر ایمان لانے والوں کے ایمان کی کوئی قیمت ہے؟ اور کیا قیامت کے دن ایسا ایمان کام آئے گا۔

جس طرح اسلام نے ایمان لانے کے لیے ذہن و فکر پر دباؤ ڈالنے کو مسترد کیا ہے اسی طرح ارادہ و اختیار پر دباؤ ڈالنے کو بھی مسترد کیا ہے۔ بھلائی کی نیت ہی قابلِ اعتبار ہے جیسا کہ آزادیِ اعتقاد کے سلسلے میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

مذکورہ حقائق کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ: اسلام دینی جنگوں سے واقف نہیں۔ وہ اپنے اصولوں کی نشر و اشاعت اور لوگوں کو اپنے دائرے میں داخل کرنے کے لیے کبھی جملہ نہیں کرتا۔

پہلی و آخری منطق دل سے قائل کرنا اور ایسی فضا میں اطمینانِ قلب ہونا ہے جس پر ہر طرح امن و سکون کا غلبہ ہو۔

اسلام صرف دو ہی صورتوں میں جنگ کی اجازت دیتا ہے: جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کا قلع قمع کرنے اور انہیں ذلیل کرنے کے لیے جارحیت کریں ان کی جارحیت کو پیا کرنے کے لیے۔ یا پھر کسی علاقہ میں ظلم و ستم و سرکشی کے شکنجوں میں سسکتی، کراہتی انسانیت کو مدد پہنچانے کے لیے۔

اور دونوں صورتوں میں — فتح یابی کی حالت میں — وہ اپنے آپ کو کسی فرد یا ملک پر مسلط نہیں کرتا۔

وہ صرف جارحیت پسندوں کی کمر توڑ دیتا ہے پھر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے اپنے پیرہے عقائد پر برقرار رہیں۔



جو آپ سے صلح کرنا چاہے آپ اس سے صلح کر لیں اور جو آپ سے جنگ کرے
آپ اس کا مقابلہ کریں تو کیا آپ کو تشدد پسند کہا جائے گا؟
قرآن کریم فرماتا ہے:

لَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ
فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ
أَنْ تَبْرُوهُمْ وَتَقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ
يَحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. إِنَّمَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ
عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ
وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا
عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ.

(الممتحنہ ۸ - ۹)

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان
لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو
جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ
نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں
نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا
ہے وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ
ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے
تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور
تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے
اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔

ظاہر ہے یہ میرا حق ہے کہ جو مجھے تنگ کرے میں اس سے کنارہ کشی کروں اور جو میرا برا
نہ چاہے اس سے دوستی کا رشتہ استوار کروں۔ اس اصول میں آخر کیا چیز قابل اعتراض ہے؟



اسلام اور بت پرستی کے درمیان زبردست خلیج کے باوجود، اسلام نے اس سے
جنگ نہیں کی بلکہ بت پرستوں سے یہی کہا کہ:

لَكُمْ دِينُكُمْ وَبِئْسَ دِينٌ
تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا
دین۔

(الکافرون -)

پھر جب جنگ بھی کی تو بت پرستی کو نیت و نابود کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف
اس کی حد سے بڑھی ہوئی جارحیت کی کڑوٹھرنے کے لیے۔ اسلام نے یہودیت سے بھی
جنگ نہیں کی بلکہ ان یہودی گروہوں سے جنگ کی جو اس پر حملہ آور ہو رہے تھے جب

ان کی جارحانہ صلاحیت ختم ہو گئی تو پھر یہودی امن و سکون سے رہنے لگے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس
ہی رہن تھی اور اس میں آپ کو کسی طرح کا خدشہ محسوس نہیں ہوا۔

یہی اسلامی مزاج و فطرت آج تک مسلمانوں کے خون میں گردش کر رہی ہے۔
فلسطین کے عربوں کے ساتھ یہودیوں نے کیا کیا وحشیانہ سلوک نہیں کیا لیکن مسلمانوں
نے کسی ملک میں یہودی مذہب کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا اور یہودی مذہب
اور جارحیت پسند یہودیوں کے درمیان فرق ہمیشہ برقرار رکھا۔ اور یہی کہتے رہے کہ ہم صرف
صہیونیوں سے برسر پیکار ہیں جن سے حضرت موسیٰ اور توریت بری الذمہ ہیں۔
حضرت موسیٰ مسلمانوں کی نگاہوں میں اپنے پیغمبر حضرت محمد کے بھائی ہیں ان پر
آسمانی کتاب نازل ہوئی جس پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کا تحسین آمیز
تذکرہ موجود ہے۔

ہم نے توراہ نازل کی جس میں ہدایت اور
روشنی تھی سارے نبی جو مسلم تھے اس کے
مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ
کرتے تھے۔ اور اسی طرح ربانی اور احبار
بھی اس پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے کیونکہ
انھیں اللہ کی کتاب کی حفاظت کا ذمہ دار
بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ
يُحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا
لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ
وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتَحْفَظُوا مِنْ
كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ۔

(المائدہ ۱۲۲)

مسلمان کبھی اس خط مستقیم سے منحرف نہیں ہوئے جبکہ طرح طرح کے نامساعد
حالات ان کے سامنے آتے رہے مثلاً فرانس الجزائر میں متعصبانہ جنگ کی آگ بھڑکاتا
رہا اور جزیر ڈیکال کو ۱۹۶۲ء میں الجزائر کی آزادی سے پہلے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی شرم
محسوس نہیں ہوئی کہ الجزائر کے ۹۰ لاکھ مسلمانوں کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔
پرانے کیسے صدیاں گزر جانے کے باوجود ٹھنڈے نہیں پڑے۔

دوسری طرف مسلمان صرف یہ کہتے رہے کہ یہ ہمارے خلاف فرانسیسی نوآبادکاروں کی جنگ ہے۔ عیسائی مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں جوڑا۔
 کیونکہ مسلمان دینی جنگوں سے آگاہ ہی نہیں۔ نہ ان کی روایات و مزاج میں یہ کبھی شامل رہی ہیں نہ کبھی ہوں گی۔

جنوبی افریقہ کے ایک سابق سفید فام صدر یہ بیان دے چکے ہیں کہ ان کی حکومت عیسائی حکومت ہے اور وہ نسلی امتیاز کی پالیسی پر اس لیے کامزن ہیں کہ افریقی سیاہ فاموں اور اسلام کے لیے مستقبل کے دروازے نہ کھلنے پائیں۔

مان لیجیے کوئی طاقت وہاں پہنچ کر مظلوم سیاہ فاموں کو آزاد کرائی تو کیا اس طاقت کو عیسائیت کے خلاف جارحیت کا مرتکب قرار دیا جاتا یا یہ واقعی صورت تسلیم کی جاتی کہ اس طاقت نے کچھ ظالموں کے احمقانہ شکجوں سے انسانیت اور عیسائیت دونوں کو نجات دلائی۔

مسلمانوں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ وہ ظالمانہ طاقت کی کمر توڑ دیں اور مظلوم عوام کے ہاتھوں کو بیڑیوں سے آزاد کر دیں۔

کوئی سوال کر سکتا ہے کہ عرب اپنے جزیرہ نما سے نکل کر شمالی افریقہ فتح کرنے کیوں گئے۔

لیکن اس سے پہلے اس سوال کا جواب ضروری ہے کہ اس سے پہلے ان علاقوں میں رومی نوآبادکار اور غاصب بن کر کیوں آئے تھے؟

مسلمانوں نے رومیوں کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا جو پولیس والے دنگا فساد کرنے والوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

کاش آج سلامتی کونسل پہلے دور کے عربوں کے اس بلند طرز عمل کو اپنانے والے کچھ لوگ پا جاتی۔

دنیا کے مختلف حصوں میں ہزار ہا کمزور و مظلوم انسان خوف سے آزادی کا حق پانے کے لیے ترس رہے ہیں۔

پھر ماضی کو ہر دم یاد رکھنا ہی کیا ضروری ہے؟

ہر مذہب کے ماننے والوں میں ایسے لوگ ہوتے رہے جنہوں نے اس کی بلند روح کو پامال کیا اور اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے اس کا استحصال کیا۔

جو کچھ گزر چکا اس پر لعنت ملامت سے کیا فائدہ ہوگا۔ آخر آج کیا چیز اس سے روک رہی ہے کہ دنیا کا نظام ایسی نئی بنیادوں پر قائم کیا جائے جن سے مشرق و مغرب ہر جگہ امن و سکون کا دور دورہ ہو جائے؟

ہم امن چاہتے ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک محفوظ مستقبل کے خواہاں ہیں لیکن کیا استعمار کے بقا کے ساتھ انسانی حقوق کو نظر انداز کر کے لوگوں کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کر کے اور اسلام کا چراغ گل کرنے اور مسلمانوں سے زندگی کا حق چھیننے کی زبردست کوششوں کے ساتھ پانڈا بنیادوں پر امن قائم ہو سکتا ہے؟

مسلمان خوف سے آزادی کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں سے بھی اس سلسلہ میں تعاون کے خواہاں ہیں۔

ایمان و عبادات

ایمان:

انسانی زندگی کی نمود و آئینہ

بہت سے لوگوں کا جو تصور ہے، ایمان اس سے بلند تر چیز ہے۔ یہ کسی شخص کے بارے میں ایک راستے قائم کرنے، کسی مسئلہ کے بارے میں کوئی حکم لگانے، کسی فلسفہ کو ماننے یا کسی طرح کے نفسیاتی رنگ میں رنگنے کا نام نہیں۔ یہ ایک سنجیدہ معاملہ کا نام ہے خدائے زندہ و کارساز کے ساتھ یہ ایک ایسے تعلق کا نام ہے جو انسان کے ظاہر سے لے کر اس کے دل کی گہرائیوں تک کو مربوط کرتا ہے۔ اس ذات کے ساتھ جو اسے عدم سے وجود میں لائی اور اس کی پرورش و پرورش کا انتظام کر کے اسے برپا و ہونے سے بچایا۔

جس طرح ایک بیکار شخص جب نئے کام میں لگتا ہے تو اس میں اس کے اوقات ہی نہیں صرف ہوتے بلکہ اس کے ذریعے وہ اپنے حال و مستقبل کا تحفظ بھی کرتا ہے۔ اسی طرح جب انسان ایمان کے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو وہ دن رات اپنی نئی ذمہ داریوں میں مشغول رہتا ہے اور ان سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے وسائل اختیار کرتا ہے۔

قرآن کریم واضح طور پر بتاتا ہے کہ الہی دعوت سے پہلے لوگوں کی مثال مردوں جیسی ہوتی ہے اور رسولوں کی اطاعت و پیروی ان کے دلوں، ان کے افکار و نظریات، ان کے اخلاق و کردار اور ان کے طریق کار کے تعلق سے ایک نئی صبح بن کر طلوع ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِيَّ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے

لِلّٰهِ وَالْمُرْسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا
يُحْيِيْكُمْ۔ رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول تمہیں اس
چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی

(الانفال - ۲۲) ہے۔

حقیقی زندگی گوشت اور خون کی ظاہری شکل کا نام نہیں۔ وہ اعضائے بدن کی حرکت
وطاقت کا نام ہے۔ اس طرح کی زندگی میں تو انسان کے ساتھ جانور بھی شریک ہوتے
ہیں اور شاید انسان سے زیادہ ہی حصہ لیتے ہیں۔
حقیقی زندگی تو نام اس تعلق کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد اس کے ساتھ
قائم ہوتا ہے۔

یہ زبانی اقرار کے بعد اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے۔
رَبَّنَا اِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْاِيْمَانِ مَالِكٌ هَمَّ نِي اِيك پكارنے والے كو سنا جو ايمان
ان اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ قٰمِنًا۔ مالک ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔
(آل عمران - ۱۹۳)

جی ہاں اس اقرار کے ساتھ ہی مومن ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جہاں وہ
صرف اللہ تعالیٰ کے آگے سر جھکاتا ہے اور اس روئے زمین پر اپنے آقا کی مرضی کے مطابق
نقل و حرکت کرتا ہے۔

اپنے تصرفات، محبت و نفرت، امن و جنگ، حلال و حرام، ثواب و عذاب، اپنے
پروردگار سے قربت کی تلاش اور وہاں سے نامراد لوٹائے جانے کے خوف وغیرہ میں
وہ محکوم و تابع دار ہوتا ہے۔

یہ ایمان ایک بالکل ہی نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔

افریقہ کے صحراؤں میں پھرتے ہوئے حبشی کو جدید ترین ماحول کے ایٹمی سائنس دان
کے مقابلے میں بہت پسماندہ سمجھا جائے گا۔

کائنات اور زندگی کے بارے میں ایک کا نظریہ دوسرے سے بالکل مختلف ہوگا
اور دونوں کے درمیان زبردست فاصلہ ہوگا۔

لیکن ایسا ہی فاصلہ اللہ تعالیٰ کو پہچاننے والے شخص اور اس سے بے خبر شخص کے درمیان بھی ہوتا ہے۔

اپنے پروردگار سے غافل انسان — چاہے ماویٰ طور پر کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو — برباد ہونے والے جانور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بعض معاملات میں ذہین ہو لیکن خدا کو نہ پہچاننا اسے پسماندگی ہی نہیں انتہائی پستی میں پہنچا دیتا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک مردہ ہے چاہے فضا کی پہنایوں ہی میں کیوں نہ چکر لگاتا پھرے اللہ تعالیٰ کو نہ پہچاننا ایک خوفناک سیاہ وصیہ ہے۔

کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلنا ہو، کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیے گئے ہیں۔

اَوْ مَن كَانَ مُتِنَانًا فَخِينَانًا وَجَعَلْنَا
لَهُ نُّورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ
كَمَن مَّثَلَهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ
بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ
لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

(الانعام - ۱۲۲)

مومن و منکر کے درمیان فرق اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے۔

ایمان والی زندگی سے نکلنے والی یہ روشنی کیا ہے؟

یہ ضمیر کی روشنی ہوتی ہے جس سے انسان بھلائی برائی میں تمیز کرتا ہے اور نیکی و بدی کو پہچانتا ہے۔

اور اسی امتیاز کی بدولت ایمان قابلِ ترجیح و احترام ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے لوگ صرف دنیاوی زندگی کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور موقع پاتے ہی کسی جرم کے ارتکاب سے باز نہیں آتے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق والے لوگ عدل و انصاف، تقویٰ و پاکیزگی وغیرہ کے کمال کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

رُودے زمین پر برکت اور معاشرے میں اطمینان و سکون اسی ایمان کے سائے میں پھیل سکتا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا
الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظُّلُمَاتُ
وَلَا الْحَرُورُ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ
وَلَا الْأَمْوَاتُ۔ (فاطر۔ ۱۹-۲۲)

اندھوں اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔ نہ
تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں نہ ٹھنڈی
چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے
اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں۔

جی ہاں! ایمان زندگی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دلوں میں ایمان کے
اثر کی تشبیہ زمین میں پانی کے اثر سے دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

” اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم و ہدایت دے کر مبعوث فرمایا ہے اس کی مثال ایسی
ہی ہے جیسے زمین پر زیادہ مقدار میں بارش ہو تو جو زمین سازگار ہوگی وہ پانی کو جذب
کر کے کافی سبزہ وغیرہ اگلے گی۔“

وحی کو روح کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے اور اندھی
نگاہوں کو روشنی بخشتی ہے۔

صحیح ایمان اور جعلی ایمان کے درمیان فرق یہ ہے کہ صحیح ایمان سے گویا آدمی از سر نو
پیدا ہوتا ہے اور ایک صحیح زندگی گزارتا ہے جبکہ جعلی ایمان سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔

صحیح ایمان بھلائی کرنے اور حق کی مدد کرنے کے لیے زبردست قوت بن جاتا ہے
جیسے کسی انجن میں ایندھن ڈال دیا جائے جبکہ جعلی ایمان سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

صحیح ایمان انسانی وجود کو اس طرح ڈھالتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ
کے تابع بن جاتا ہے اور اسی کے نام پر ہر قدم اٹھاتا ہے جبکہ جعلی ایمان انسان کو محض
اپنی خواہش کا غلام بناتا ہے۔

اگر حکومتیں کھوٹے سکوٹوں اور نوٹوں کی روک تھام کے لیے جعل سازوں کے خلاف
سخت قدم اٹھاتی ہیں تو پھر کیا یہ اس سے زیادہ مناسب بات نہیں ہوگی کہ جعلی ایمان
کو مٹانے کی کوشش کی جائے تاکہ صحیح ایمان کی قیمت اور اس کے معنوی و مادی اثرات

اور فوائد برقرار رہیں۔

اگر ہم سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ایمان کی صحت کی حفاظت سونے چاندی اور نوٹوں کی صحت کی حفاظت سے زیادہ اہم ہے۔

ایمان جو زندگی پیدا کرتا ہے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے فضا پر کتنی ہی تاریکی کیوں نہ مسلط ہو بلکہ اہل ایمان کو صبر و ثبات قدمی سے کام لینا چاہیے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا
حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس
کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی
شک نہ کیا۔ (الحجرات - ۱۵)

اور ایمان کسی ایک مسلک میں محدود نہیں حق کا جو بھی تقاضا ہو اس کو ماننا ضروری ہے چاہے حالات کتنے ہی بدل جائیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَ
جَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ
أَوْوُوا وَنَصَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ
حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ
جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ
میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں
نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں ان
کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین
رزق ہے۔ (الانفال - ۷۴)

ایمان جو زندگی پیدا کرتا ہے اس میں یہ محال ہے کہ غلطی و کجی بغیر گرفت کے رہ جائے چاہے اس کے نتیجے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ درپیش ہوں۔ کیونکہ اہل ایمان کو حق کی بات کہنے اور صبر و ثبات سے کام لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔

کبھی لوگ سرکش حکمراں کی گرفت سے گھرا جاتے ہیں کبھی زندگی کی راحتوں میں کھو کر نرم پڑ جاتے ہیں جبکہ صحیح ایمان صرف خدا کی خوشنودی کی طلب اور اسی کے غضب سے خوف پیدا کرتا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ
اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تَلَّكُمُ
سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ
کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی

عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا (الانفال - ۲)

آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

کچھ لوگ اپنی خاص پوزیشن کے تحفظ کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں لگائے رہتے ہیں۔

آج کے دور میں عوام کی طرف سے فرد کی پوجا اور فرد کی طرف سے عوام کی پوجا بھی عام ہو چکی ہے۔ اگر انسان اپنے ہر عمل، ترک عمل اور خرچ وغیرہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پیش نظر رکھے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ یہ ریا کاری ہے جس سے عمل ساقط ہو جاتا ہے اور دل برباد ہو جاتا ہے۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں:

”اگر کسی بندے کو حضرت آدمؑ کی قناعت، حضرت عیسیٰؑ کا زہد، حضرت ایوبؑ کا صبر، حضرت یحییٰؑ کی اطاعت، حضرت ادریسؑ کی استقامت، حضرت ابراہیمؑ کی محبت اور حضرت محمدؐ کا اخلاق مل جائے اور اس کے دل میں غیر اللہ کی ذرا بھی گنجائش ہے تو اللہ تم اس سے بے نیاز ہوگا“

یہ حقیقت بھی ہے کہ دل میں ریا کا پیدا ہونا ایمان کے لیے تباہ کن اور ثواب کے لیے ہلک ہے۔

بارش نازل ہوتی ہے تو زرخیز زمین کی صلاحیت نمود جاگ جاتی ہے اور وہی بارش پتھر پر پڑے تو اس کے بخر بن اور سختی ہی کو نمایاں کرتی ہے۔

فَمَثَلُهُ كمثلِ صَفْرَانٍ عَلَيْهِ تَرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ

اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کلاتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا اور

(البقرہ - ۲۶۴) کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں۔
ایمان جو زندگی استوار کرتا ہے اس کی امتیازی خصوصیت پروردگار عالم کے لیے
گہرا اخلاص اور مکمل یکسوئی ہے۔

ایمان انسانی رجحانات و جذبات کا رخ پھیر دینے کے فیصلہ کن عمل کا نام ہے۔
جو انسان کسی دینی چھاپ سے محروم ہے وہ بھی رنج و راحت، بردباری و غضب،
تکبر و تواضع، نرمی و سختی اور یاس و امید جیسے انسانی جذبات و حالات سے دوچار ہوتا ہے
لیکن جعلی ایمان اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

قدیم زمانے سے تربیتی ماہرین اللہ تعالیٰ سے انسان کے خوف، اس سے امید،
اس کی طرف رجوع اور اس پر انحصار وغیرہ کی ضرورت پر زور دیتے رہے ہیں۔
یہ درست ہے لیکن حقیقت کا یہ صرف ایک پہلو اور تصویر کا ایک رخ ہے اور عوام
نے پوری بات نہیں سمجھی۔

سب ملتے ہیں کہ ایمان صبر و شکر اور امید و بیم کا نام ہے۔
لیکن کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ اس طرح کے احساسات ایمان دل میں پیدا کر دیتا۔
ہے۔ لیکن دل اپنی عام فطرت پر باقی رہتا ہے۔ کبھی اللہ سے ڈرتا ہے کبھی غیر سے کبھی اللہ
سے امید لگاتا ہے کبھی غیر سے۔

یہ نہ تو مقصود ہے نہ مخلصانہ و مکمل ایمان ہے۔
مومن اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملے میں، اس کی توجید اور اس کے اسماء و صفات
کے ادراک میں اپنے طرز زندگی کی بنیاد اپنے پروردگار کے لیے مکمل سپردگی، صرف اسی سے
تعلق اور اس کے ماسوا کو نظر انداز کرنے پر رکھتا ہے۔

یہ توجید نہیں ہے کہ ہم پتھر کے بتوں کو تو نہ مانیں اور مال و دولت کو، جاہ و عزت
کو، عورت کو یا حکراں کو بت بنا لیں اور اپنے تمام یا کچھ احساسات و جذبات کا رخ ان
نئے بتوں کی طرف پھیر دیں۔ ظاہر و باطن کی بیشتر سرگرمیاں ان کے لیے ہوں اور تھوڑی سی
اللہ تعالیٰ کے نام پر۔

یہ بات عام نظر آتی ہے کہ بہت سے لوگ اپنے خالق کے لیے گرم جوشانہ جذبات نہیں رکھتے جبکہ دوسروں کے لیے گرم جوش ہیں۔
آخر یہ کون سا ایمان ہے؟

یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ بزعم خود اللہ تعالیٰ سے امید قائم کرتے ہیں لیکن ان کے طرز عمل میں اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ ناؤ خشکی پر نہیں چلا کرتی۔

بہت سی دینی تہذیبیں اس لیے زوال کا شکار ہوئیں کہ حقیقت سے ان کا تعلق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جب انسانی نفس کی باگ ڈور بیدار ایمان کے بجائے خواہشاتِ نفس کے ہاتھوں میں آجائے تو محض نام سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

جب انسانی احساسات کا تعلق ایمان سے کمزور پڑ جائے تو گناہ ہی کا رشتہ باقی رہ جاتا ہے کیونکہ اگر انسان کے قلب کی گہرائیوں میں ایمان جاگزیں نہیں تو وہ ایک بیمار ایمان ہے اور اس کے علاج کی ضرورت ہے۔

مثلاً الشریعہ تو کُل مومن کے دل میں اقتدار پر انحصار سے کہیں زیادہ مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح دنیا کے عاجلانہ فائدوں کے مقابلے میں آخرت کی تزیح مومن کے دل میں کہیں زیادہ طاقتور ہونی چاہیے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنُ يَشْتَرُ مِنْ
دُونِ اللَّهِ أَثَدًا لَّيُجِبُّوهُمْ كَذِبًا
اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حَبَابًا
اللَّهُ - (البقرہ - ۱۶۵)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسرا اور مددِ مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔

ایمان زندگی کو طاقت و نمو بخشتا ہے اور اسے تقوا و احترام کے لائق بناتا ہے۔ آج کے دور میں بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ دین نام ہے انسان اور اس کے پروردگار کے درمیان شخصی تعلق کا یعنی یہ انسان اور حواس سے بالاتر غیبی قوتوں کے درمیان تعلق کا نام ہے اور اس کی نمائندگی زیادہ تر فرد کی عبادتی رسموں سے ہوتی ہے۔

اس طرح کا گمان اسلام کے تعلق سے بالکل صحیح نہیں۔
اسلام کا دائرہ وسیع ہے اور اس کی تعلیمات محدود نہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور انسان
کے درمیان تعلق، انسان اور انسان کے درمیان تعلق اور انسان اور زندگی کے درمیان
تعلق سب کا احاطہ کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام انسان اور اس کے پروردگار کے
درمیان تعلق کی جو تشریح کرتا ہے اس میں انسان کی داخلی زندگی سے لے کر انسان کے دیگر اشیاء کے
ساتھ تعلقات بھی شامل ہیں وہ ان سب چیزوں کے ساتھ معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ
اپنے تعلق، اس سے وفاداری، اس کی ہدایات کی پیروی اور اس کی مکمل فرماں برداری
کی روشنی میں کرتا ہے۔

وحی الہی جس پر یہ دین قائم ہے ہمد سے لحد تک انسان کے مختلف معاملات
سے بحث کرتی ہے اور ان کے سلسلے میں مناسب راستہ دکھاتی ہے۔
ایمان کے دائرے کی وسعت ہی کی وضاحت کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

”ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں۔ ان میں سب سے اہم شعبہ لا الہ الا اللہ کا اقرار
اور سب سے معمولی شعبہ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا ہے اور حیا ایمان کا ایک
شعبہ ہے۔“

گویا یہ شعبے ارکان دین، اصول اخلاق اور آداب وغیرہ تک سب کا احاطہ کرتے
ہیں۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ ایمان نفس، معاشرہ
اور ریاست سب پر اثر انداز ہوتا ہے اللہ کے حکم کا لحاظ گھر کے اندر بھی کرنا چاہیے
اور سڑک پر بھی۔ انسان کے اپنے دل کے ساتھ بھی اور دیگر انسانوں کے ساتھ بھی۔
زندگی کا کوئی پہلو دین کے رنگ اور اس کے اصول و مقاصد سے الگ نہیں رہنا چاہیے
اسلامی تعلیمات کی درجہ بدرجہ ترتیب ہے۔

ایمان زندگی کی مشین کو ہم آہنگی کے ساتھ حرکت میں لانے والی چیز ہے۔

جسم کے کسی اہم حصہ مثلاً دماغ پر ہلک حملہ ہو یا مثلاً ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

لیکن بعض اجزاء کو نقصان پہنچنے سے زندگی نہیں ختم ہوتی لیکن جسم ناکارہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایمان بھی کامل و ناقص طور پر موجود و مفقود ہوتا ہے۔

صحیح ایمان کا اثر انسان کے دل کے محرکات و مقاصد پر، معاشرے کے نظام و معاملات پر اور زندگی کی عمرانی و اقتصادی سرگرمیوں پر بھی پڑنا چاہیے تاکہ سب کا رخ دین کی خدمت کی طرف ہو جائے۔

اسلام کے ارکان ان تمام حقائق سے تعلق رکھتے ہیں۔

مثلاً نماز اور روزہ ذاتی ایمان کے ارکان ہیں اور فردان کی ادائیگی کے لیے جو ابدہ ہے۔

ان سے انسانی دل میں پاکیزگی، اخلاص اور بلندی پیدا ہوتی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ایمان کو معاشرہ پر بھی اثر انداز ہونا چاہیے۔

اس کے لیے مثلاً اللہ کی راہ میں جہاد اور جدوجہد اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق فیصلے کرنا ہے جن سے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور فرد کے ساتھ ساتھ ان کی بنیادی ذمے داری معاشرے پر ہوتی ہے کیونکہ معاشرہ ہی ان کا انتظام کر سکتا ہے۔

اسلام جہاں دل میں یقین پیدا کر کے انسان کو عمل و کردار پر ابھارتا ہے وہیں وہ دولت کے وسائل کے بارے میں رہنمائی کرتا ہے تاکہ دولت کو معاشرے کی صحیح خطوط پر تشکیل اور اسے مثالی بنانے کا ذریعہ بنایا جاسکے۔

ان وسائل سے دنیا کا کوئی ایسا نظام ہی بے نیازی اختیار کر سکتا ہے جو زوال و خودکشی کا خواہاں ہو۔

○
حق کی اپنی حرمت ہوتی ہے جو انسان کو اس کی قدر کرنے اور آخر تک اسے مضبوطی سے پکڑے رہنے پر آمادہ کرتی ہے۔

حق کے لیے جوش و جذبہ صحیح ایمان کا اثر ہے۔
حافظ بیہقیؒ اس کو ایمان کا شعبہ قرار دیتے ہوئے حضرت انسؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس شخص کے اندر تین باتیں ہوں وہ ایمان کی حلاوت پالے گا۔

یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اسے باقی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں۔

اور یہ کہ آدمی صرف اللہ ہی کے لیے محبت کرے۔

اور یہ کہ اسے آگ میں ڈال دیا جانا اس سے زیادہ پسند ہو کہ وہ پھر کفر میں واپس

لوٹ جائے اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کفر سے نجات دی تھی“

حق پسندی یہ بھی ہے کہ بغیر لالچ یا خوف کے اصولی بنیاد پر دوستی یا مخالفت کی جائے۔

یعنی اللہ کے لیے لوگوں سے محبت یا ناپسندیدگی۔

اور حق کی سر بلندی نیز باطل کے انہاد کے لیے گواہی۔

اس شعبہ ایمان کا تعلق ادبِ نفس سے ہے اور انفرادی عبادات کے ساتھ ساتھ چلتا

ہے اور اس کا اجتماعی اثر فیصلہ کن اور واضح ہوتا ہے۔

حافظ بیہقیؒ نے حلال روزی کمانے کو بھی ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا ہے۔ کیوں کہ

حدیث میں آیا ہے:

”لوگو اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک چیز ہی قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

اہل ایمان کو بھی وہی حکم دیا ہے جو اپنے رسولوں کو دیا تھا یعنی:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ

وَأَعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ۔

جانتا ہوں۔

(المومنون - ۵۱)

لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ

کھاؤ۔

حَلَالًا طَيِّبًا۔ (البقرہ ۱۶۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم حقیقت میں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ

طِبَابَتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ۔
اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں

ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ۔
(البقرہ - ۵ - ۱۷۲)

پھر آپ نے ایسے آدمی کا ذکر فرمایا جو لباس سفر کرتا ہے اور پریشانی و پرانگندہ حالی کے عالم میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یارب یارب کہتا ہے (یعنی دعا کرتا ہے) جبکہ اس کا کھانا، لباس اور مشروب حرام ہوتا ہے اور حرام ہی سے اس کی پرورش ہوتی ہوتی ہے تو کہاں سے اس کی دعا قبول ہو۔“

یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ساری توانائیاں دنیا ٹوٹنے پر لگاتے ہوئے ہیں لیکن ان کی برائیوں اور حرام خوری کی وجہ سے انہیں اللہ کی رحمت کا کوئی حصہ نہیں ملتا۔
روزی کمانے میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نتیجہ ذریعہ کو بھی درست کر دیتا ہے اس لیے حلال، حرام کی پروا کیے بغیر ہر طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

جس طرح چھوٹے لوگ روزی کمانے کے سلسلے میں ہر طریقہ اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح بڑے لوگ ان منصوبوں کے حصول کے لیے ہر طریقہ اختیار کرتے ہیں جن سے ان کی جاہ و منزلت اور دولت میں اضافہ ہو۔ جبکہ اہل ایمان ان سب سے بری الذمہ ہوتے ہیں۔
بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے ایک دن دودھ پیا تو انہیں اچھا لگا۔ پلانے والے سے دریافت کیا کہ یہ دودھ کہاں سے لائے؟ اس نے بتایا کہ وہ کسی چٹھے پر گیا تھا وہاں زکوٰۃ والی اونٹنیاں بھی پانی پی رہی تھیں وہاں ان کا دودھ نکالا گیا تو میں نے بھی اپنے برتن میں لے لیا۔ یہ وہی دودھ تھا۔

حضرت عمرؓ نے منہ میں ہاتھ ڈال کر قے کر دی۔

حضرت بشر بن حارث حضرت یوسف بن اسباط سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص عبادت کرنے لگتا ہے تو ابلیس اپنے چیلوں سے کہتا ہے کہ دیکھو اس کی روزی کا ذریعہ کیا ہے؟ اگر وہ حرام ہوتا ہے تو کہتا ہے اسے تھوڑو اس کے لیے وقت ضائع نہ کرو۔

یعنی اسے محنت کرنے دودھ خود اپنی محنت رائیگاں کرنے کے لیے کافی ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ سے نماز باجماعت میں پہلی صف کی فضیلت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: یہ دیکھو کہ روٹی کا جو ٹکڑا کھا رہے ہو وہ کیسے حاصل ہوا ہے پھر چاہے آخری صف میں نماز پڑھ لو۔

یعنی نفل سے پہلے فرض پر دھیان دینا ضروری ہے۔
اگر بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ پہلی صف میں نماز پڑھنے سے حرام روزی کا کفارہ ہو جائے گا تو وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو پہلی صف کی طرف تیزی سے بڑھتے دیکھا تو فرمایا: حلال روزی کھانے کی طرف تیزی دکھانی چاہیے۔

دنیا سے ایمان کا تعلق صرف باعزت ڈھنگ سے روزی کمانے تک سے نہیں بلکہ زمین کے خزانوں سے روزی حاصل کرنے کی جستجو بھی بہترین کمائی ہے۔

زمین پر استحکام حاصل کرنا، اس کے خزانوں کو نکالنا، مختلف پیشوں میں مہارت حاصل کرنا، کائنات و وجود کے اسرار و رموز کو سمجھنا، یہ سب ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر بنی آدم زمین کی خلافت کے مستحق ہوئے۔

اور انہیں خصوصیات میں کمی زیادتی سے ان کی حیثیت میں کمی زیادتی ہوتی ہے زندگی کی باگ ڈور سنبھالنے میں حق و باطل کے اصولوں کے درمیان مسابقت کا انحصار بھی اسی فوقیت پر ہے۔

زندگی کے مختلف فتون میں بہترین مہارت اور ان کا بہترین استعمال، حق کی بالادستی کے لیے لڑائی کا حصہ ہے اور جب اس کا مقصد اللہ کی خوشنودی کا حصول ہو تو اس کا شمار ایمان کے شعبوں میں ہوگا۔

اس میدان میں پسماندگی سے اہل ایمان اپنے عقائد کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔

صحیح ایمان معاشرہ و ماحول کو اپنی منزل مقصود کی طرف لے جاتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔

ایمان کے شعبوں میں حسنِ اخلاق بھی ہے اور اس میں غصہ کو پی جانا، نرمی اور تواضع وغیرہ شامل ہیں۔

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقِي عَظِيمٌ۔
اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

(القلم - ۱۳)

وَإِنكَ ظَمِيمٌ الْغَيْظِ وَالْعَافِيْنَ
عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔
جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے
قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ
کو بہت پسند ہیں۔ (آل عمران - ۱۳۴)

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم فحش باتوں سے دور دور تھے اور فرماتے تھے کہ ”تم میں سے بہترین یا وہ لوگ ہیں جو
اخلاق میں سب سے بہتر ہیں۔“

ایک روایت میں ہے: ”مجھے تم میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو سب
سے بہتر اخلاق والا ہے۔“

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزوں میں جب بھی اختیار دیا گیا تو آپ نے
آسان تر کو اختیار کیا جب تک اس میں گناہ نہ ہو۔ اگر گناہ کی چیز ہوتی تو آپ سب سے
زیادہ اس سے دور رہتے۔ آپ نے کبھی اپنے لیے انتقام نہیں لیا ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی
حرمت کی پامالی کا معاملہ ہو تو آپ اللہ تعالیٰ کے لیے انتقام لیتے تھے۔“

بیہوشی کہتے ہیں کہ حسنِ اخلاق کا مطلب ہے نرم ترین اور بہترین افعال پر نفس کو
ثابت قدم رکھنا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام پر بندے کو شرح صدر حاصل ہو اور پوری خوش دلی
کے ساتھ انھیں بجالائے۔ نیکی کے کاموں میں رغبت رکھے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بہت سی
مباح چیزوں کو بھی چھوڑ دے اور دل میں تنگی نہ محسوس کرے۔ لوگوں کے ساتھ معاملات
میں روادار ہو اگر وہ بیمار پڑے اور کوئی عیادت نہ کرے، اگر سفر سے آئے اور کوئی

ملنے نہ آئے، اگر سلام کرے اور کوئی جواب نہ دے، اگر کسی کی دعوت کرے اور وہ نہ آئے
کوئی سفارش کرے اور وہ نہ مانی جائے، کہیں جائے اور اسے باقاعدہ جگہ نہ ملے، کسی
دوست سے ملنے جائے اور ملنے کی اجازت نہ پائے، کہیں شادی کا پیغام دے اور وہ
منظور نہ ہو، قرض خواہ سے ہمت مانگے اور وہ نہ دے وغیرہ تو ایسی صورتوں میں ناراض نہ
ہو اور اپنی بد حالی پر رنج نہ کرے اور یہ محسوس نہ کرے کہ وہ جفا و وحشت کا شکار ہو رہا ہے۔
اور جب اپنا موقع آئے تو وہ خود ویسا ہی سلوک نہ کرے اور جس نے بد سلوک کی ہو اس
کے ساتھ بہتر سلوک کرے اور ماضی میں اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کو فراموش کر دے۔
گویا ہر صورت میں بہترین سلوک اپنائے۔

عبادات

اسلام محبت کے جذبہ کے ساتھ مجبوعہ کے سامنے دل کو جھکانے کا نام ہے۔
 یہ کسی فتح کے سامنے مفتوح و مغلوب کے جھکنے کا نام نہیں۔
 یہ ایک محبت کرنے والے کی اطاعت اور فداکاری ہوتی ہے اس ذات کے لیے
 جس کی تقدیریں و عظمت اور ہیبت اس کے دل میں ہوتی ہے
 اور انسان صرف اپنے پروردگار کے ساتھ ہی اس حالت میں ہو سکتا ہے۔ اگر کسی
 بھی شخص کو عوام کا معبود قرار دیا جائے تو یہ بالکل غلط ہوگا۔
 عبادت میں پسند اور شوق کے ساتھ تعظیم اور رعب بھی شامل ہوتا ہے جو پروردگار
 عالم کے ساتھ ہی مخصوص ہے اس لیے کسی اور کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔
 بعض مشرقین نے عبادت کا مفہوم صحیح نہیں سمجھا اور یہ گمان کیا کہ عبادت کا
 مطلب کسی ایسی طاقت کے سامنے سر کو جھکانا ہے جو مطلق قوت یا آسمان سے نازل ہونے
 والی دہشت کی نمائندگی کرتی ہے۔

پھر اس غلط مفہوم کے ساتھ اسلام پر کتبہ چینی شروع کر دی اور کہتے لگے کہ اسلام
 انسانوں اور ان کے خالق کے درمیان تعلق کی بنیاد خوف و ذلت پر قائم کرتا ہے نہ کہ محبت
 و مہربانی پر۔
 یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے۔

اسلام تو صرف خالق کی ترجمانی کرتا ہے وہ مخلوق کو خالق کے بارے میں بلا کم و کاست

بتانا ہے۔ جس سے کچھ احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً جب لوگوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کو نعمتیں دینے والا اللہ ہے تو ظاہر ہے اس کے شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔

اور جب یہ بتایا جائے کہ وہی تمام معاملات کی تدبیر کرنے والا ہے تو ظاہر ہے کہ تمام معاملات میں اسی کی طرف نگاہ جائے گی۔

اور جب انسان یہ جان لے کہ بالآخر اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہوگا تو لازماً انجام کی طرف توجہ ہوگی اور ثواب و عذاب کا خیال پیدا ہوگا۔

جب اللہ تعالیٰ کو کمال و بڑائی کی ساری صفات حاصل ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی توقیر و تعریف نہ کی جائے۔

اسی طرح جب یہ بھی معلوم ہے کہ وہ گناہ پر سخت سزا دینے والا ہے تو کیسے اس کی ہدایت دل پر طاری نہ ہو؟



عبادت اللہ تعالیٰ کے تعلق سے اسی موقف کا نام ہے اور قرآن کریم کے مطالعہ سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

اے لوگو اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو کیا اللہ کے سوا کوئی بنانے والا ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ - (فاطر - ۳)

اے لوگو بے شک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے سو تمہیں دنیا کی زندگی کافی نہ بہکائے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّكُمْ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا - (فاطر - ۵)

اے لوگو اپنے رب سے ڈرتے رہو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَخَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ - (النساء - ۹)

ان ہدایات کو پورے شعور کے ساتھ قبول کرنے کا نام ہی عبادت ہے اور ہم پر یہ

لازم آتا ہے کہ ہم صرف اسی کی عبادت کریں اس کے شایانِ شان اس کی حمد و ثنا کریں اور اس کے معاملے میں شوق یا خوف سے غافل نہ رہیں۔

قُلْ لِمَنْ مَّا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
قُلْ لِلَّهِ كَتَبَ عَلَي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ
لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْمِيَامَةِ لَا رَيْبَ
فِيهِ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فَهُمْ
لَا يُؤْمِنُونَ

پوچھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے کس کا
بے کہہ دو اللہ کا ہے اس نے اپنے ذمے
مہربانی لکھی ہے البتہ تم کو قیامت کے دن تک
اکٹھا کر دے گا۔ اس میں کچھ شک نہیں جو لوگ
اپنی جان کو نقصان میں ڈال چکے ہیں وہی ایمان
نہیں لاتے۔

رالانعام - ۱۱۲

عبادت یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو یقین کے ساتھ پہچانیں اور اس کی ہدایات کی پیروی کریں۔

جب کسی کمزور شخص کے کسی طاقتور شخص سے مدد لینے اور کسی جاہل شخص کے کسی ذی علم سے روشنی حاصل کرنے میں کوئی تعجب کی بات نہیں تو پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ مخلوق اپنے خالق و رازق کی پیروی کرے؟

عبادت یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کا اعتراف کیا جائے اور مخلوق کی فطری ڈیوٹی ظاہر کی جائے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا
لِيَعْبُدُونِ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ
رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطِيعُوا
إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُرَّةِ
الَّتِينِ (الذاریات - ۵۶ - ۵۸)

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام
کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں
میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ
چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں بے شک اللہ ہی
رزق دینے والا اور ٹھوس قوت والا ہے۔



عبادت انسان اور اس کے پروردگار کے درمیان براہِ راست تعلق کا نام ہے جس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں۔

اسلام نے اس تعلق کی تشریح بہت واضح طور پر کی ہے اور اس میں بیچ کے واسطوں اور سفارشوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔

اگر آپ نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو کوئی فرشتہ یا انسان بیچ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی بڑے چھوٹے کو ساتھ لیے بغیر اپنے آقا کے دروازے پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو کوئی بھی آپ کو اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنے اور معافی مانگنے سے نہیں روک سکتا۔

عبادت تو لوگوں اور ان کے پروردگار کے درمیان براہ راست تعلق ہی کو کہتے ہیں۔ اور یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا اتنا ہی آقا کے نزدیک بندے کا مرتبہ بھی زیادہ ہوگا۔ کسی پستی میں گر جانے والے آدمی کا مرتبہ اس سے بلند نہیں ہو سکتا کہ اس کی ترجمانی کوئی ولی یا کوئی راہب و پوپ کرے۔ اسے فائدہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی پستی سے نجات حاصل کرے۔

اب اگر وہ اپنی ذاتی جدوجہد سے پاک و صاف ہوتا ہے تو کامیاب ہو گیا ورنہ کوئی اسے فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اسی طرح جو بلندی کے مقام پر فائز ہے اسے آسمان وزمین کی کوئی دوسری چیز پست نہیں کر سکتی۔

کہو کیا میں اب اللہ کے سوا کوئی رب تلاش کروں اور وہی ہر چیز کا رب ہے۔ اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اس کے ذمہ ہے اور ایک شخص دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْعَثُ رَبًّا وَهُوَ رَبُّ
كُلِّ شَيْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ
اِلَّا عَلَيْهِهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ
وِزْرَ اٰخَرٰى۔

(الانعام - ۴ - ۱۶۳)

اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ اس کی سعی غمگیناں دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی۔

وَاَنْ لِّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنْ
سَعٰیہٗ سَوَفَ یُرٰی شَمَّ یَجْزٰہُ
الْجِزَاۃَ الْاُولٰٓئِی۔ (النجم - ۳۹ - ۴۱)

بہت سے خود ساختہ دعوے داروں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان اس تعلق میں خود کو دخل ظاہر کرنے کی کوشش کی اور یہ خیال پھیلا یا کہ بندوں کو براہ راست اپنے رب سے رجوع کرنے اور اس سے توبہ و استغفار کرنے کے بجائے ان کے واسطے سے ایسا کرنا چاہیے گویا ان دعوے داروں کے واسطے کے بغیر عبادت قبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن قرآن کریم نے فیصلہ کن انداز میں ان کی تکذیب فرمائی۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا
اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ
وَمَا هُمْ بِحَامِلِينَ مِنْ خَطَايَاهُمْ
مِنْ شَيْءٍ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ وَ
لَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَنْتَ لَا مَع
أَثْقَالِهِمْ - (العنكبوت - ۱۲-۱۳)

اور منکر ایمان والوں کو کہنے لگے تم ہماری راہ پر چلو اور ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے اور وہ ان کے گناہ کچھ نہ اٹھائیں گے۔ بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ البتہ وہ اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اس کے ساتھ کتنے ہی بوجھ اٹھائیں گے۔

اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاف اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔ اور جو برائی کما لے تو اس کی یہ کمائی اس کے لیے وبال ہوگی اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانائے۔

اور خیر دار کو اس قرآن سے ان لوگوں کو جن کو اس کا ڈر ہے کہ وہ اپنے رب کے

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ
ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ
فَاسْتَفْزَرُوا إِلَيْهِمْ وَمَنْ يَفْزِرْ
إِلَّا إِلَى اللَّهِ -

(آل عمران - ۱۳۵)

وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبْ
عَلَى نَفْسِهِ وَكَانَ اللَّهُ حَكِيمًا -

(النساء - ۱۱۱)

وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ
أَنْ يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ

مِنْ دُونِهِ وَرَبِّيَ وَلَا شَفِيعَ -

ر الانعام - ۵۱۰

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ
قُلْ أَوْ لَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا
يَعْقِلُونَ قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا -

ر الزمر ۲۲-۲۳

سامنے جمع ہوں گے اس طرح کہ اللہ کے سوا نہ
ان کا کوئی حمایتی ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا۔
کیا انہوں نے اللہ کے سوا کوئی سفارش کرنے
والے پھرے ہیں کہہ دو کیا وہ سفارش کریں
گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ ہو نہ ہو اور وہ
سمجھتے بھی نہ ہوں۔ کہہو سفارش ساری کی ساری
اللہ کے اختیار میں ہے۔

ان آیات سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ لوگوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور اسٹنہ
نہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ سے رجوع کریں، اس کے ماسول سے بالکل مایوس ہو جائیں
اور یہ سمجھ لیں کہ ہر انسان اپنے بائے میں جو ابدہ ہے اور اس کا عمل ہی اسے آگے یا پیچھے
اور بلند یا پست کرتا ہے۔

اس طرح اسلامی معاشرے میں کاہنوں اور واسطوں کا طبقہ ختم ہو گیا اور ہر انسان
نے یہ جان لیا کہ اس کا معاملہ کسی اور مخلوق کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود اس کے اپنے ہاتھ
میں ہے۔

عبادت کی قسمیں

عبادت دو قسم کے اعمال کہے جاتے ہیں۔
ایک قسم وہ ہے جس کی حقیقت اور ظاہری ہیئت خود شارع نے بتائی ہے جیسے
ناز اور روزہ وغیرہ۔

دوسری قسم میں تمام انسانی سرگرمیاں شامل ہیں اگر ان کا مقصد نیک اور طریقہ
صحیح ہو۔ اس قسم میں اخلاقی و اجتماعی نظریات بھی شامل ہو جاتے ہیں جن کا تعلق انسان
کے حالات اور زندگی کے معاملات سے ہے۔

مسلمان کے طرزِ عمل کی امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے عام افعال و عادات
پر مقررہ مقصد اور متعین نیت کی چھاپ ہوتی ہے۔

مثلاً تجارت ایک عام عمل ہے جو ہر طرح کے لوگ کرتے ہیں لیکن یہی عمل اس
وقت عبادت بن جاتا ہے جب مسلمان اس نیت سے کرے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی
ضرورت پاکبازی کے ساتھ پوری کرے گا، اپنی اولاد کی پرورش کرے گا اور قوم کی خدمت
کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت کو جہاد قرار دیا ہے اور قرآن کریم
نے اسے شب بیداری اور کثرتِ تلاوت سے معاف رکھنے میں جہاد کے مساوی قرار
دیا ہے۔

وَاللَّهُ يَمْدِدُ الرَّاكِبِينَ وَالسَّهْمَاءَ عَالِمِينَ السُّرِّيَّ دَانَ أَوْرَاتِ كِ اَوْقَاتِ كِ اَحَابِ

رکھتا ہے، اسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا
 ٹھیک شمار نہیں کر سکتے لہذا اس نے تم پر ہر پانی
 فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو
 پڑھ لیا کرو، اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض
 ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی
 تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ اور لوگ اللہ
 کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پس جتنا قرآن
 باسانی پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔

أَنْ لَّنْ تَحْصُوا فَنَابَ عَلَيْكُمْ
 فَاقْرُؤُوا مَا يَسَّرَ مِنْ
 الْقُرْآنِ عَلِيمٌ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ
 مَرْضَىٰ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ
 فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ
 اللَّهِ وَآخَرُونَ يَمَاتُونَ فِي
 سَبِيلِ اللَّهِ فَاقْرُؤُوا مَا يَسَّرَ مِنْهُ

(المزمل - ۲۰)

البتہ تجارت اسی وقت عبادت ہوگی جب اسی مقصد کے ساتھ کی جائے اور ساتھ
 ہی فریب دہی، جعل سازی، جھوٹ، سود اور ظلم وغیرہ جیسی اخلاقی برائیوں سے اسے آلودہ
 نہ کیا جائے۔

یہی حالت زراعت کی بھی ہے۔ اسے دیندار بھی کرتا ہے اور بے دین بھی۔ لیکن اگر
 مذکورہ مقاصد اور شرائط کے ساتھ کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم فرماتے ہیں:

”جس نے کوئی درخت لگایا اور صبر کے ساتھ اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ یہاں تک
 کہ وہ پھل دینے لگے تو اس کا جو پھل بھی کسی کے کام آئے گا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک
 (درخت لگانے والے کے لیے) نیکی شمار ہوگا۔ (احمد)

اور جتنا زیادہ فائدہ ہوگا اتنا ہی زیادہ اسے ثواب بھی ملے گا۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

موت کے بعد جب بندہ اپنی قبر میں ہوتا ہے تو سات چیزوں کا اجرا سے ملتا رہتا
 ہے، جس نے کوئی علم سکھایا، یا نہر جاری کی، یا کنواں کھودا، یا کوئی پیر لگایا، یا مسجد تعمیر کی
 یا قرآن کریم کا نعت پڑھی، یا اولاد چھوڑی جو موت کے بعد اس کے لیے دعائے
 مغفرت کرے۔ (بخاری)

عام افعال کو نیک نیتی اور اچھے مقصد کی بنا پر عبادت قرار دینا اسلام کا ثابت شدہ حکم ہے اس کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مومن کی بیشتر عبادات اسی قبیل سے ہوتی ہیں کیونکہ اس طرح کے افعال پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں اور ان کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔ انھیں انگلیوں پر شمار کرنے کی ضرورت نہیں۔ انسان زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے۔

جو انجینئر کوئی مشین بناتا ہے وہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ وہ اپنا کام بحسن و خوبی انجام دیتی رہے۔ ہوائی جہاز کی قیمت اسی وقت تک ہے جب تک وہ پرواز کر سکتا ہے قلم اسی وقت تک اہمیت رکھتا ہے جب تک وہ لکھ سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کو پہلے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو یقین و سلامت روی سے سنوارنا چاہیے اس کے بعد وہ زندگی میں جو کچھ کرے گا وہ خود بخود اللہ کی اطاعت بن جائے گا۔

سکہ ڈھالنے کی مشین میں دھات ڈالی جاتی ہے تو قیمتی سکہ بن کر نکلتا ہے اور اس کی ساخت اور مہر اسے کوئی دوسری ہی چیز بنا دیتی ہے اسی طرح مسلمان جب دنیا کے کسی معاملہ کو ہاتھ میں لیتا ہے تو اس پر اپنے ایمان کی چھاپ لگاتا ہے جس سے اس کا ہر کام قیمتی عبادت بن جاتا ہے۔ اسی صلاحیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَالُوا لَنْ نَبْدُ خُدَّ الْجَنَّةِ
إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارًا
تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا
بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْكُنُوا
مَعْتَدًا وَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ
فَ تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ فَيُضِلَّ
كُلَّ سُلُوكٍ سَلْبًا
وَهُوَ مُحْسِنٌ قُلْ لَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ
رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ - (البقرہ - ۱۱۱ - ۱۱۲)

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب کہ وہ یہودی نہ ہو یا عیسائیوں کے خیال کے مطابق عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، دراصل نہ تمہاری کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی۔ حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے، اس کے لیے اس کے رب کے پاس

اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف
یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

اور زندگی کے میدان میں نیک اعمال کی تحدید نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کے
لیے خود سپردگی اور کام کو مطلوبہ حسن و کمال تک پہنچانے کے لیے کیا جائے وہ نیک عمل ہے۔



اسلام نے جن عبادات کو کسی قالب میں ڈھالا ہے اور ان کے لیے وقت وغیرہ مقرر
کیا ہے وہ محدود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی
تشریح فرمایا کرتے تھے ایک بہت مشہور حدیث ہے کہ:

« اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ کی گواہی دینا،
نماز قائم کرنا، زکاۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور جو استطاعت رکھتا ہو اس کا حج
کرنا» (بخاری)

اس سے زیادہ جامع حدیث حافظ منذری کی روایت ہے:

« اسلام کے آٹھ حصے ہیں اور جسے کوئی بھی حصہ نہیں مل سکا وہ نامراد ہوا۔ ایمان
ایک حصہ ہے، نماز ایک حصہ ہے، روزہ ایک حصہ ہے، زکاۃ ایک حصہ ہے، حج ایک حصہ ہے، جہاد
ایک حصہ ہے، بھلائی کا حکم دینا ایک حصہ ہے اور بُرائی سے روکنا ایک حصہ ہے۔
سنت بھلائی اور نصیحت سے بھری ہوئی ہے ہم اس میں سے امراض کے مطابق دوا
چن لیتے ہیں۔

قرآن کریم انسانی سلوک کے مختلف پہلوؤں کا ذکر بڑے متوازن انداز میں کرتا ہے۔
کُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ اِذَا
ہر شخص اپنے کسب کے بدلے رہن ہے دائیں
اَصْحَابَ الْيَمِيْنِ فِيْ جَنَّاتٍ
بازو والوں کے سوا بوجہ جنتوں میں ہوں گے،
يَسْتَأْذِنُوْنَ عَنِ الْمَجْرِمِيْنَ - مَا
وہ مجرموں سے پوچھیں گے، تمہیں کیا چیز دوزخ
مِيْنَ لَعْنَتِيْ؟ وہ کہیں گے، ہم نماز پڑھنے

مِنَ الْمُصَلِّينَ وَكُنْتُمْ تَكْتُمُونَ
 الْمَسْكِينِ وَكُنْتُمْ تُخَوِّضُونَ مَعَهُ
 الْخَائِضِينَ وَكُنْتُمْ تَكْتُمُونَ يَوْمَ
 الْبَيْتِ حَتَّىٰ آتَانَا الْيَقِينَ -
 (المدثر: ۳۸-۴۰)

والوں میں سے نہ تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں
 کھلاتے تھے، اور حق کے خلاف باتیں بنانے
 والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے
 تھے، اور روز جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے
 یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش
 آگیا۔

جن آیات میں عبادات کا ذکر آیا ہے ان میں دو باتیں قابل ذکر ہیں:

۱۔ اسلام نے جن عبادات کا حکم دیا ہے وہ بہت سی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ انسان
 کے لیے وہ پریشان کن اور ہمت شکن ہوں بلکہ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بدن کی درنگی
 اور صحت کے تحفظ کے لیے بہت سی غذاؤں دی جائیں۔

زندگی کا راستہ لپا ہے اور اس میں بہت سی پیچیدگیاں آتی ہیں مثلاً آپ کسی
 شہر میں ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جائیں تو بہت سے سنگل آپ کو روکیں گے
 سڑک پر چلنے والی یہ سڑخ و سبز بتیاں راستے میں رکاوٹ ڈالنے اور لوگوں کو پریشان کرنے
 کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ ان کی حفاظت اور ٹریفک کے نظام کو آسان و مضبوط بنانے
 کے لیے ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ بندوں کو زندگی کی راہ میں اپنی مرضی کے مطابق چلنے کے لیے آزاد نہیں
 چھوڑتا ورنہ دنیا بگاڑ اور تکلیف دہ چیزوں سے بھر جائے۔

قَهْلُ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوا
 فِي الْاَرْضِ وَتَقَطَعُوا اَرْحَامَكُمْ
 اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ
 فَاَصْمَتْهُمْ وَاَعْمٰى اَبْصَارَهُمْ -
 (محمد: ۲۲-۲۳)

اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع
 کی جا سکتی ہے کہ اگر تم اطمینان پھر گئے تو زمین
 میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک
 دوسرے کے گلے کاٹو گے یہ لوگ ہیں جن پر اللہ
 نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور سہرا بنا دیا۔

بندوں پر شفقت کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ ہدایت و رہنمائی دے کر پریشانیوں سے

بچاتا ہے اس لیے ہمیں زیادہ ہدایتوں اور کثرتِ تلقین سے گھرانہ نہیں چاہیے۔ وہ تو ہمارے ہی فائدے کے لیے ہیں۔

۲۔ یہ عبادات متنوع قسم کی ہیں۔ ان کی حیثیت صرف ایک ہی روحانی غذا کی نہیں بلکہ طرح طرح کی تربیت و تعلیم کے درمیان قرآن کریم اس طرح ہم آہنگی پیدا کرتا ہے کہ وہ انسانی فطرت کی حقیقت کے مطابق ہو جائیں۔

قرآن کریم میں اخلاق کے لیے الگ باب، عقیدہ کے لیے الگ باب، معاشرہ کے لیے الگ باب اور منوعات وغیرہ کے لیے الگ الگ باب نہیں ہیں۔ بلکہ وہ انسان کو اس زندگی میں مختلف پہلوؤں سے تصرف کرتے دیکھتا ہے اور اس کے لیے جامع قسم کی ہدایات دیتا ہے۔

مثلاً یہ آیتیں پڑھیے:

وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا إِنَّهَا سَاعَةٌ مُسْتَقَرَّةٌ وَمَقَامًا

رحمن کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے مزہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں جو دعائیں کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے اس کا عذاب تو جان کالا گو ہے، وہ تو بڑا ہی بڑا مستقر اور مقام ہے۔"

(الفرقان۔ ۶۲-۶۶)

ان میں لطیف انداز میں اخلاق اور اجتماعی سلوک کی تعلیم بھی ہے یعنی تواضع اور چال چلنی سے درگزر کی۔ پھر شروع و خضوع کے ساتھ شب بیداری کا بھی ذکر ہے جو مومن کے لیے خاص نعمت ہے۔

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ لی اس نے گویا نصف شب نماز میں

گزار می۔ اور جس نے فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لی اس نے گویا بقیہ نصف شب نماز میں گزار دی۔ (مالک)

اس طرح اولیٰ و آخر شب کی نمازوں کے ذریعہ بندہ نیند کا استقبال پاکی کے ساتھ کرتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 "ان جموں کو پاک کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں پاک کر دے گا۔ جو بندہ بھی طہارت کی حالت میں رات گزارتا ہے اس کے ساتھ ایک فرشتہ بھی ہوتا ہے جو رات میں ہر پہلو بدنے پر دغا کرتا ہے کہ اے اللہ اپنے بندے کی بخشش فرما کیونکہ اس نے طہارت کی حالت میں رات گزار دی ہے۔" (طبرانی)

پھر اللہ تعالیٰ سے نجات کی دعا ہے۔ ظاہر ہے مسلمان جہنم کے عذاب سے ڈرتا ہے اور اس سے ڈرنا ہی چاہیے۔

انسانی زندگی میں برے رجحانات کی روک تھام کے لیے فوری یا کچھ دیر سے سزائیں ناگزیر ہیں۔

انفرادی اور قومی جرائم محض نصیحتوں اور تقریروں سے نہیں روکے جاسکتے بلکہ ان کی ویسی ہی سزائیں روک تھام کر سکتی ہیں۔
 آخرت کے عذاب سے نجات کی دعا صرف زبان سے نہیں ہوتی بلکہ عمل و سلوک سے ہوتی ہے۔

ان سے کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرو، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں مسلم بنوں، کہو، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف۔

اللہ کے بندوں کی صفات کا سلسلہ آگے چلتا ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا
وَلَمْ يَقْتَرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ
قَوَامًا۔ (الفرقان - ۶۷)

جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں
نہ سخی، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے
درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔

یہ بہترین اقتصاد کی رہنمائی ہے کیونکہ خرچ میں اعتدال فرد کے لیے بھی اچھی چیز
ہے اور معاشرے کے لیے بھی۔

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا
آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي
حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ
وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا
يَضَاعَفَ لَهُ الْعَذَابَ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ وَيَخُذُّ فِيهِ مَهْمَانًا
إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا
صَالِحًا فَأُولَئِكَ يَبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ
حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا
وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ
يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا۔

جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے
اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک
نہیں کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں
یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے
گا، قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا
جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے
ساتھ پڑا رہے گا۔ الا یہ کہ کوئی دان گناہوں
کے بعد، توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح
کرنے لگا ہو، ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ
بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور
رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار
کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے

(الفرقان - ۶۸ - ۷۱)

جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔

یعنی اعتقاد میں توحید اور عمل و سلوک میں نیک نیتی و اخلاص۔

انسانی خون یعنی زندگی کے حق کی حرمت۔

دونوں جنسوں کے درمیان پاکیزگی کی بنیاد پر تعلقات۔

یہ سب عبادتیں اسلامی معاشرے کے ارکان ہیں اور عام زندگی میں ان کا تحفظ ضروری ہے۔

اب اگر کسی شخص سے غلطی ہو جائے تو اس کے لیے توبہ کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ رجوع کرنے والے دل کے لیے آسمان کے دروازے بند نہیں۔ جو بھی خدا کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے گناہ سے نجات کا راستہ موجود ہے۔

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ (اور رحمن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ (الفرقان - ۲۷)

خاص و عام معاملوں میں جھوٹی گواہی بہت بڑی برائی ہے۔ جھوٹی گواہی اور جعل سازی سے جان و مال کا نقصان تو ہوتا ہی ہے لیکن عام معاملات میں اس کے نتائج اور بھیانک نکلتے ہیں۔

اہم مناصب کے لیے معمولی صلاحیت و کردار کے نااہل لوگوں کو امیدوار بنانا اور انتخابات میں ایسے لوگوں کو ووٹ دینا بھی جھوٹی گواہی میں داخل ہے۔ اللہ کے بندوں کو اس طرح کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ کے بندے نفسیاتی طور پر نرم دل ہوتے ہیں اور نصیحت و رہنمائی کو مانتے ہیں اس طرح کے نہیں ہوتے کہ:

سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْهُمْ امَّ امَّ
أَنْتُمْ صَامِتُونَ۔

(الاعراف - ۱۹۳)

بلکہ اگر تم انھیں سیدھی راہ پر آنے کے لیے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔

إِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى
لَا يَسْمَعُوا وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ
إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ۔

(الاعراف - ۱۹۸)

بلکہ اصحاب بصیرت کی طرح فوراً چونک اٹھتے ہیں۔

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ
لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا۔
جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت
کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن
کر نہیں رہ جاتے۔

(الفرقان - ۴۳)

اللہ کے بندے دنیا میں مستحکم خاندان کے خواہاں ہوتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ سے
دعا کرتے ہیں کہ انھیں ایسی بیوی ملے جس سے دل اور آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ایسی اولاد
ملے جن سے ان کا دل خوش ہو جائے اور وہ آخرت میں بلند مقام حاصل کریں۔

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ
لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا ذُرِّيًّا طَيِّبَةً
أَعْيُنِنَا وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا
أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ
بِمَا صَبَرُوا وَيَلْقَوْنَ فِيهَا
سَلَامًا وَسَلَامًا خَالِدِينَ
فِيهَا حَسَنَاتٌ مُّسْتَقَرًّا وَمُقَامًا۔
جو دعائیں مانگا کرتے ہیں "اے ہمارے رب،
ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی
ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام
بنا" یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزل
بلند کی شکل میں پائیں گے۔ آداب و تسلیمات
سے ان کا استقبال ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں
رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام۔

(الفرقان - ۴۴ - ۴۶)

گویا عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات سب کو باہم مربوط کیا گیا ہے تاکہ ان
اوصاف کے ذریعہ لوگ رحمت کرنے والے اللہ کے بندے بن جائیں اور یہ مرتبہ ہر ایک
کو نہیں ملتا بلکہ اسی کو ملتا ہے جو اس کے لیے تیاری اور کوشش کرے گا۔



قرآن کا طریقہ تربیت یہی ہے اور بار بار مختلف سورتوں میں ان کو دہرایا گیا ہے
مثلاً سورۃ النعام کی آیات (۱۵۱-۱۵۲) سورۃ رعد کی آیات (۱۹-۲۵) سورۃ بنی اسرائیل کی
آیات (۲۳-۲۸) سورۃ شوریٰ کی آیات (۲۴-۲۳) سورۃ مومنون کی آیات (۱۱-۱۱) پڑھیے۔
جن میں ایسی بہترین باتیں اور نصیحتیں ہیں جو انسانی سیرت و سلوک کے مختلف پہلوؤں کی

رہنمائی کرتی ہیں صرف کسی ایک پہلو کو لے کر باقی پہلوؤں کو نظر انداز کر دینا کج فہمی ہوگی۔



اللہ تعالیٰ نے جہاں کچھ فرائض بتائے ہیں وہیں کچھ چیزوں سے منع فرمایا ہے۔ اور ان کے ارتکاب سے ڈراتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان سے نیکیاں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔ ظاہر و باطن دونوں میں ان برائیوں سے بچنا ضروری ہے اور اس پروردگار سے خوف کھاتے رہنا ضروری ہے جو دلوں کی مخفی چیزوں اور گوشہ چشم کی حرکات تک سے بخوبی واقف ہے۔

وَذُرُوا ظَاهِرَ الْأَيْمَنِ وَبَاطِنَهُ
 إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْأَيْمَنُ سَيُجْزَوْنَ
 بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ (الانعام - ۱۱۰)

تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی بچو لوگ گناہ کا اکتاب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص وہ ہوتا ہے جو مخلوق کے سامنے تو نیکی اور خشوع و خضوع ظاہر کرتا ہے اور جب تنہا ہوتا ہے تو برائی کرنے سے نہیں بھجکتا۔

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”میں اپنی امت کے کچھ ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو قیامت کے دن پہاڑ جتنے روشن اعمال لے کر آئیں گے لیکن اللہ تعالیٰ انہیں بالکل ہوا کی طرح اڑا دے گا۔
 ثوبانؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں ان کے بارے میں صاف صاف بتا دیجئے۔
 کہیں ہم ناواقفیت کی بنا پر ان میں سے رہو جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تم میں سے اور تمہارے بھائی ہی ہوں گے۔ رات کو تمہاری ہی طرح شب بیداری بھی کرتے ہوں گے لیکن وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ جب تنہائی میں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی حرمتیں پامال کریں گے۔“ (ابن ماجہ)

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے جو گناہ ناپسندیدہ قرار دیے ہیں ان کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں۔

کسی کی نوعیت معمولی ہوتی ہے۔

اور کوئی اتنا سنگین ہوتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہی منقطع ہو جاتا ہے۔ ایمان کی بنیاد تہیں نہیں ہو جاتی ہے اور بندہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ کچھ غلطیاں ایسی ہو جاتی ہیں جن میں کچھ وقت یا کچھ مال ہی ضائع ہوتا ہے اور بعض جرائم ایسے سرزد ہو جاتے ہیں جن سے زندگی ہی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

پھر معمولی گناہوں کی جرأت بسا اوقات نفس کو بالکل سرکشی ہی تک پہنچا دیتی ہے۔ اسلام گناہوں سے ڈراتا ہے، ضمیر میں محاسبہ کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور مسلمان کو ہر ایسا کام کرنے سے احتیاط کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا والا ہو۔ انسانی نفس چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے اکثر محفوظ نہیں ہوتا۔ بڑے گناہوں اور جرائم کی روک تھام اور امت کو ان کی ہلاکتوں سے بچانے کے لیے اسلام بھر پور زور دیتا ہے۔

اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کر دیں گے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوا كِبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ
نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ
مَدْخَلًا كَرِيمًا۔

(النساء - ۳۱)

نماز

وقتاً وقتاً دیہاتوں کے سٹاؤں اور شہروں کے شور و غوغا کو چیرتی ہوئی ایک دلاویز، منظم اور بامعنی زوردار آواز کا نونک پہنچتی ہے۔

یہ ناقوس کی بے معنی آواز یا بانسری کی جذبات خیز نغمہ سرائی نہیں ہوتی بلکہ دل و دماغ کو ایک ساتھ اپیل کرنے والی آواز ہوتی ہے۔

وہ ذہن و احساس میں زندگی کی پاکیزہ ترین حقیقت کو پھر سے ذہن نشین کراتی ہے اور دنیا کی آلائشوں میں پھنسے ہوئے دل و دماغ کی غفلت کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔ یہ مؤذن کی آواز ہوتی ہے:

اللہ سب سے بڑا ہے

اللہ سب سے بڑا ہے

ہیں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اسلام کا پیغام انسان کو بلندی تک پہنچانا اور معنوی و مادی ترقی کے ایک شریفانہ معیار پر برقرار رکھنا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نماز مشروع کی ہے۔

اور اس سے پہلے طہارت واجب قرار دی ہے کیونکہ انسانی جسم کو بار بار نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ گندگی اور بدبو اس پر مسلط نہ ہو جائیں اسی لیے بار بار اسے دھونا اور صاف کرنا ضروری ہوتا ہے۔

پورے بدن کو پاک کرنا سب سے پہلے ضروری ہے پھر بار بار جسم کے مختلف اعضاء کو دھونا پڑتا ہے۔

اسلام نے انسانی سر بلندی کے لیے جہاں ایمان کو بنیادی قرار دیا ہے وہیں جسمانی صفائی کو اس ایمان کا نصف قرار دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

”وضو ایمان کا ایک حصہ ہے“ (ابوداؤد)

”دین کی بنیاد صفائی ستھرائی پر رکھی گئی ہے“ (تیسیر الوصول)

انسانیت نے شروع سے آج تک اسلام سے زیادہ انسان کی صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کے تعلق سے حساس کوئی اور دین دیکھا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اس پر زور دینے والی کوئی اور شخصیت۔

بے شمار احادیث میں ان کی تاکید آئی ہے حتیٰ کہ منہ اور ناک وغیرہ کے صاف کرنے پر گناہوں کی بخشش کی خوشخبری دی گئی ہے اور اس صفائی ستھرائی کے بعد جب مسلمان نماز پڑھتا ہے تو وہ معصوم بچے کی طرح پاک صاف ہوجاتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالمطلب بیان کرتے ہیں کہ دور جاہلیت میں بھی میں خیال کرتا تھا کہ بتوں کی پوجا کر کے لوگ گمراہی میں مبتلا ہیں۔ پھر میں نے مکہ مکرمہ کے ایک شخص کے بارے میں سنا کہ کچھ باتیں بتاتے ہیں۔ میں اپنی سواری پر بیٹھا اور وہاں پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور باتوں کے علاوہ میں نے دریافت کیا:

”یا رسول اللہ! مجھے وضو کے بارے میں بتائیے۔“

آپ نے فرمایا: تم میں سے جو آدمی وضو کرنے بیٹھتا ہے اور کھلی کرتا ہے اور ناک صاف کرتا ہے تو اس کے چہرے کے گناہ منہ اور ناک سے نکل جاتے ہیں پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے کے گناہ داڑھی کے کنارے سے بھرتے ہیں۔ پھر جب وہ کہنیوں تک ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھ کے گناہ انگلیوں سے پانی کے ساتھ جھڑ جاتے ہیں۔

پھر سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔
 پھر وہ ٹخنوں تک پیر دھوتا ہے تو انگلیوں سے پیر کے گناہ پانی کے ساتھ جھڑ جاتے
 ہیں پھر جب وہ نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے شایان شان اس کی حمد و
 ثنا کرتا ہے۔ اور اپنا دل پوری طرح اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ رکھتا ہے تو اس طرح
 معصوم واپس لوٹتا ہے جیسے اپنی پیدائش کے دن معصوم تھا۔ (مسلم)



اسلام میں نماز اپنے پروردگار کے لیے بندے کے احساس کے تعبیر کا نام ہے۔

حالتِ قیام میں نمازی قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔

رکوع و سجود میں عملی و زبانی طور پر اللہ تعالیٰ کی پاکی و بزرگی بیان کرتا ہے۔

حالتِ قعدہ میں اپنے رب کو سلام پیش کرتا ہے۔

پھر نماز ختم کرتے ہوئے دائیں بائیں سلام کرتا ہے۔

اگرچہ نماز صبح، دوپہر، عصر، مغرب اور عشاء کے اوقات میں فرض ہے لیکن فرض

رکعتوں کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں اور کل ملا کر آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگتا۔

کیا دن اور رات کے مختلف حصوں میں روحانی و ذہنی بیداری کے لیے یہ وقت

زیادہ ہے؟

انسان باقی ساڑھے تیس گھنٹوں میں کیا کرتا ہے کبھی اس پر بھی غور کرتا ہے؟ کچھ لوگوں

کے مزاج میں ناقابلِ علاج ناشکر اپن ہوتا ہے انھیں نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونا تو اچھا

لگتا ہے لیکن شکر یہ ادا کرنا بھاری محسوس ہوتا ہے۔

جو لوگ ان نمازوں میں کوتاہی کرتے ہیں وہ درحقیقت نہ خالق کے یہاں قدر دانی

کے مستحق ہیں نہ مخلوق کے احترام کے جو اپنی ڈیوٹی ہی نہ ادا کرے ظاہر ہے وہ کبھی عزت

کا حقدار نہیں ہو سکتا۔

اس طرح کے لوگوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔

ایک قسم تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کاہلی اور غفلت کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے

بارے میں حضرت عبادہ بن صامت کی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں جس نے انہیں ادا کیا اور ان کے حق کو معمولی سمجھ کر ضائع نہیں کیا تو اس کے لیے اللہ کے یہاں وعدہ ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کر دے گا اور جس نے انہیں ادا نہیں کیا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی وعدہ نہیں اگر وہ چاہے گا تو سزا دے گا اور اگر چاہے گا تو جنت میں داخل کر دے گا۔ (مالک)

دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کے دل ایمان اور حق کی معرفت سے خالی ہوتے ہیں ان کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس روایت میں اشارہ ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن نماز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

”جس نے ان نمازوں کی پابندی کی وہ قیامت کے دن ان کے لیے نور، دلیل اور نجات کا ذریعہ بن جائیں گی اور جس نے ان کی پابندی نہیں کی ان کے لیے نہ نور نہیں گی اور نہ دلیل و نجات، ایسا شخص قیامت کے دن فاروق، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا“ (احمد)

روزہ

اس عبادت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو پائے، اپنی خواہش کو اپنے تابع کرے اور اس کی یہ صلاحیت طاقتور ہو جائے کہ وہ جس چیز کو چاہے چھوڑ سکے اور ناپسندیدہ چیز کو برداشت کرے۔

یعنی روزہ نام ہے انسانی ارادہ کو آزاد کرنے اور اسے خواہشات نفس کے بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع بنانے کا۔

اور ارادہ کی آزادی ہی انسان اور جانور کے درمیان زبردست فرق پیدا کرتی ہے جانور جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز سے پریشانی محسوس کرتا ہے اسے چھوڑ دیتا ہے اس کے عزم اور شہوت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ سرے سے اس کے پاس عزم ہی نہیں ہوتا۔ اس کی خواہشات اور فرائض کے درمیان کوئی کشمکش ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے لیے بہت سی رکاوٹیں ہیں جو اسے بہت سی چیزوں سے روکتی ہیں۔ اگر اس کی عقل غالب ہے تو وہ اپنی خواہشات کو اپنی مرضی کے مطابق قابو میں رکھ سکتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ جانوروں سے زیادہ قریب ہے۔

خواہشاتِ نفس سے رکنا انسان اور جانوروں کے درمیان ہی فرق نہیں پیدا کرتا بلکہ کامیاب و ناکام انسانوں کے درمیان بھی خط امتیاز کھینچتا ہے۔ کسی بھی چیز میں کامیابی کا ذریعہ یہی ہے کہ نفس کو دشواریاں برداشت کرنے، سختیوں کو جھیلنے اور خواہشات پر قابو رکھنے کی صلاحیت ہو۔

قدیم زمانہ سے جو لوگ بلند یوں کے طلب گزار رہے ہیں وہ اس حقیقت سے واقف رہے ہیں اور یہ جانتے رہے ہیں کہ بڑی راحت و شواہوں اور مشکلات کو پار کر کے ہی حاصل ہوتی ہے جو شخص بھی کوئی بڑی چیز حاصل کرنا چاہتا ہے اسے بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ بڑائی حاصل کرنے کا واحد راستہ یہی ہے۔

اسلام نے روزہ اسی لیے مشروع کیا ہے کہ لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کے بجائے ان پر قابو پانا سیکھیں۔

اسی لیے اہل ایمان پر روزے میں یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک اپنے زبردست طبعی تقاضوں کو پورا نہ کریں بلکہ وقتی محرومی کی مشق کریں اور عملی تربیت کے ذریعے اس حدیث کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں کہ،

”جنت ناپسندیدہ چیزوں سے اور جہنم خواہشاتِ نفس سے ڈھانک دی گئی ہے“

(تیسیر الاصول)

روزہ کچھ چیزوں سے رکنے کا ایک منفی عمل ہے جسے لوگ اپنی نگاہوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ یہ اخلاص کی طرح ایک پوشیدہ راز ہے جسے عالم الغیب ہی جانتا ہے یہی اس حدیثِ قدسی کا مطلب ہے کہ،

”روزہ میرے لیے ہے“ (بخاری)

یہ نفس کے مادی تقاضوں سے بھی رکننا ہے اور غصہ وغیرہ جیسی اخلاقی حالتوں سے بھی۔ روزہ وار پر سکون اور پروقار رہتا ہے جس سے اسے تزکیہ نفس اور ذکر الہی میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ، ابن آدم کا ہر عمل اس کے اپنے لیے ہے سوائے روزے

کے۔ یہ میرے لیے ہے اور میں ہی (خاص طور پر) اس کی جزا دوں گا۔ روزہ ڈھال ہے

جب تم میں سے کسی کے روزے کا دن ہو تو نہ جہنی ضرورت پوری کرے اور نہ شورو

شغف کرے۔ اگر کوئی اسے گالی دے یا اس سے لڑے تو کہہ دے کہ میں روزے سے

ہوں، میں روزے سے ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے۔ روزہ دار کے منہ کی بوا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ خوشگوار ہے۔

روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ جب وہ افطار کرتا ہے تو وہ اس انظار سے خوش ہوتا ہے اور جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہوگا تو اپنے روزے (کی جزا) سے خوش ہوگا۔ (بخاری)

لوگوں کو جو مشقتیں پیش آتی ہیں ان کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں؛ مثلاً غیر سنجیدگی کے مقابلے میں سنجیدگی، بیکاری کے مقابلے میں کام، باطل کے مقابلے میں حق اور بیٹھے رہنے کے مقابلے میں جدوجہد کی مشقتیں۔

نفس کو یہ سب مشقتیں تھیلنی پڑتی ہیں کیونکہ ان کے بغیر ایمان کا تصور ہی دشوار ہے۔ لیکن کچھ مشقتیں اعلیٰ کمال اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی مشقت کا اشارہ اپنے نبیؐ سے اس وقت کیا جب آپؐ کو لوگوں کی ہدایت پر مامور کرتے ہوئے، پیغام کی اہمیت اور شب بیداری پر زور دیا۔

اِنَّا سَلَّمْنٰ عَلَیْكَ قَوْلًا تَقْوِيًّا
ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ (المزمل - ۵)

بلاشبہ رسالت کے ساتھ عظیم ذمے داریوں کے پیش نظر یہ بھاری بات ہے لیکن عظیم منصوبوں کی ذمے داریاں بھی اتنی ہی عظیم ہوتی ہیں۔

اس طرح کی مشقت زبردست شخصیات کے حامل لوگوں پر ہی ڈالی گئی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا منتخب فرمایا۔ ایک مشقت وہ ہوتی ہے جو نفس جھیل سکتا ہے۔

لَا يَكْلِفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اللہ کسی متنفس پر اس کی قدرت سے بڑھ کر

(البقرہ - ۲۸۶) ذمے داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

روزہ مسلمان کو مشقت جھیلنے کی تربیت دینے ہی کے لیے ہوتا ہے۔



بہتر حکم دیکھو۔ نئے اور اسے عمل سے روکنے کا نام نہیں۔ ورنہ کوئی یہ بھی

کہہ سکتا ہے کہ جسمانی ریاضتیں انسانی جسم کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔
روزہ ایک ایسی بامقصد ریاضت اور ایک ایسا پودا ہے جو پھل لاتا ہے۔
یہ لوگوں کو معنوی بلند یوں پر پہنچنے کی تربیت دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ وہ کیسے
بھلائی کریں اور برائی چھوڑیں، کیسے اچھی چیز سے محبت کریں اور ناپسندیدہ چیز سے نفرت
کریں اور کیسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی طرف دوڑیں اور اس کی ناراضگی سے بھاگیں۔
یہ جسم کے خلاف کسی مبہم معرکہ آرائی کا نام نہیں بلکہ دل کے تزکیہ، ایمان کی تقویت،
اور مشقت کا اجر اللہ تعالیٰ سے طلب کرنے کا نام ہے۔

تقویٰ کی طرف دل کے اسی میلان، دنیاوی خواہشات سے بے رغبتی اور فرشتوں
کے ماحول کی طرف رجحان کی اسی فضا میں یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم اسی مہینے میں
نازل ہوا اور اہل ایمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ دن بھر روزہ رکھنے کے بعد اپنی راتیں
نمازوں سے مزین کریں اور اپنی زبانیں کتاب الہی کی تلاوت سے تر کریں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

”جس نے ایمان اور ثواب کی نیت کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے اس

کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں“ (بخاری)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ
عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فَمَن
كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى
الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ
طَعَامٌ مِّسْكِينٍ فَمَن تَطَوَّعَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے
فرض کر دیے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے
پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع
ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔ چند
مقررہ دنوں کے روزے ہیں اگر تم میں سے
کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں
میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے اور شروع میں یہ اجازت ہی
دی گئی کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں پھر

رکھیں تو وہ فدیہ دیں ایک روزے کا فدیہ
ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی
سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اسی کے لیے
بہتر ہے لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا
یہی ہے کہ روزہ رکھو، رمضان وہ مہینہ ہے
جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسان کے لیے
سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر
مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی حق
و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔
لہذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو
لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے
اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے
دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے اللہ
تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا
نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا
ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور
جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا
ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف
کرو اور شکر گزار بنو۔

خَيْرًا فَهُمْ خَيْرٌ لَهُ وَان تَصُومُوا
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ -
شَهْرَ رَمَضَانَ الَّذِي اُنزِلَ فِيهِ
الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ
مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ
شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ
وَ مَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلَى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اٰخَرَ
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمْ الْيُسْرَ وَلَا
يُرِيْدُ بِكُمْ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا
الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا لِلّٰهِ عَالِي مَا
هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ -

(البقرہ - ۱۸۳ - ۱۸۵)

روزہ دنوں میں ایک پاکیزہ و روشن ماحول پیدا کرتا ہے، اور دن میں حاصل ہونے
والی پاکیزگی شب بیداری میں قرآنی ہدایات کے استقبال کے لیے تیار کرتی ہے جس کی
بدولت مسلمان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و مغفرت سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔
حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے روزہ کہے گا۔
اے پروردگار! میں نے اسے کھانے اور شہوت سے روک دیا تھا اس لیے اس کے
بارے میں میری سفارش قبول فرمائے۔ اور قرآن کہے گا میں نے اسے رات کی نیند سے
محروم کیا تھا اس لیے اس کے بارے میں میری سفارش قبول کر لے۔ آپ نے فرمایا تو دونوں
کی سفارش قبول کر لی جائے گی۔“ (احمد)

حضرت عبدالستارؒ عمروؓ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا:

”افطار کے وقت روزہ دار کی دعا روزہ نہیں کی جاتی“

اور خود حضرت عبدالستارؒ افطار کے وقت یہ دعا کرتے تھے کہ ”اے اللہ! میں
تیری اس رحمت کے واسطے سے جو ہر چیز سے زیادہ وسیع ہے تجھ سے اپنی بخشش مانگتا
ہوں“

ایک دوسری روایت میں ہے:

”تین آدمیوں کا حق ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا روزہ کرے: روزہ دار جب
تک افطار نہ کرے، مظلوم جب تک اس کی مدد نہ ہو جائے اور مسافر جب تک لوٹ کر
واپس گھر نہ پہنچ جائے“ (بزار)

اس سے ان دونوں آیتوں کی تشریح بھی ہو جاتی ہے جو روزہ والی آیتوں سے پہلے ہیں۔
وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي
قَرِيبٌ أَجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا
بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔

اور جواب دیتا ہوں لہذا انھیں چاہیے کہ میری
دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں شاید
کہ وہ راہِ راست پالیں۔

(البقرہ - ۱۸۶)

زکوٰۃ

زکوٰۃ مال میں اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے پہلا اور سب سے اہم حق ہے۔
 زکوٰۃ نکلانے کی بنیاد اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل کرنے، اس کے حکم کے نفاذ اور ثواب
 کی طلب پر ہے۔

زکوٰۃ کوئی زبردستی کا ٹیکس نہیں جو جبراً زکوٰۃ نکالے یا نمود و نمائش کرے یا
 احسان جتائے، اس کا عمل بے قیمت ہے اور اسے عبادت نہیں سمجھا جائے گا۔
 یہ تو ثواب کا ایسا کام ہے جس کا انحصار نیک نیتی پر ہے اور اس کا اول و آخر مقصد
 اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے یہ نماز، تقویٰ اور استغفار جیسی چیز ہے، اور ایمان کا اہم
 رکن ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے سو اس
 کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو ڈر رکھتے
 ہیں اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا
 لِلَّذِينَ يُتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ
 وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ۔

(الاعراف - ۱۵۶)

اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے۔ وہ جو کہتے
 ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے ہیں
 سو ہمارے گناہ بخش دے اور ہم کو دوزخ کے

وَاللَّهُ بِصِرِّ الْعِبَادِ۔ الَّذِينَ يُقُولُونَ
 رَبَّنَا آمَنَّا غَيْرَ لَنَا ذُنُوبُنَا وَإِنَّا
 مَعَدَّة النَّارِ أَنْصَابِ بَرِيَّةٍ وَالصَّادِقِينَ

وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ
بِالْآسْحَارِ
عذاب سے بچا۔ وہ صبر کرنے والے اور سچے
اور حکم بجالانے والے اور خرچ کرنے والے اور رات کے پھلے
پہر گناہ بخشوانے والے ہیں۔ (آل عمران - ۱۵ - ۱۷)

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا
رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ - أُولَئِكَ هُمُ
الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا. (الانفال - ۳ - ۴)
وہ لوگ جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور ہم نے ان
کو جو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے
ہیں وہی سچے ایمان والے ہیں۔

زکاۃ کا ذکر اخلاق میں سچائی کے ساتھ اور عبادات میں نماز کے ساتھ آتا ہے اور
اس کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ سحر کے وقت اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلبی کا بھی ذکر ہے۔
یہ اقتصادی منصوبہ — چاہے زکوٰۃ کی ادائیگی کی وجہ سے جتنی بھی وسعت و برکت ہو
سے پہلے نسیانی اطاعت ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ تمیم کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں کافی دولت و جائداد اور اہل و عیال
رکھتا ہوں مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیسے خرچ کرنا چاہیے؟
آپ نے فرمایا: اپنے مال سے زکاۃ نکالو وہ تمہیں پاک کرے گی۔
اپنے رشتے داروں کے ساتھ سلوک کرو اور مسکین و یتیموں اور سائل کا حق
پہچانو۔ (احمد)

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”جو ایمان کے ساتھ پانچ چیزیں لے کر آیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔“
جس نے پانچوں نمازوں کی پابندی، وضو، رکوع و سجود اور ان کے اوقات کے
ساتھ کی، رمضان کے روزے رکھے، استطاعت ہوئی تو حج کیا، خوشدلی سے زکاۃ دی
اور امانت ادا کی۔

عرض کیا گیا: امانت کی ادائیگی کیا ہے؟
آپ نے فرمایا: جنابت سے غسل کرنا، اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے دین میں اس کے

سوا کوئی اور چیز امانت نہیں قرار دی۔ (طبرانی)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”تین چیزوں کے بارے میں قسم کھانا ہوں: جس کا اسلام میں کوئی حصہ ہے
 اللہ تعالیٰ اسے اس شخص کی طرح نہیں بنائے گا جس کا کوئی حصہ نہ ہو۔ اور اسلام کے حصے
 تین ہیں: نماز، روزہ اور زکوٰۃ۔ اور ایسا نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی بندے کو
 اپنائے اور قیامت کے دن اسے کسی دوسرے کے سپرد کر دے۔“ (احمد)

پھر زکوٰۃ معاشرے کی خلیجوں کو پاٹی ہے اور اسے برباد ہونے سے بچاتی ہے۔
 زکوٰۃ کے ذریعے فقر و فاقہ کی ذلت سے لوگوں کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔

بہر صورت مسلمان کو کشادہ حالی میں بھی خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تنگدستی
 میں بھی لوگوں کی مصیبت دور کرنے کے لیے خرچ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ
 وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ
 أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ
 فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ -
 اور دوڑو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور
 جنت کی طرف جس کا عرض آسمان اور زمین ہے
 پر سیر گزاروں کے واسطے تیار ہوتی ہے جو خوشی
 میں اور تکلیف میں خرچ کیے جاتے ہیں۔

(ال عمران - ۱۳۳ - ۱۳۴)

خوشحالی میں تو خرچ کرنے کی بات واضح ہی ہے۔ تنگدستی میں اس صورت میں خرچ
 کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جب دوسرے لوگوں کی حالت قابل رحم حد تک بری ہو جائے
 ایسی صورت میں اپنے کھانے تک میں سے دے دینا چاہیے اور ایسا خوشدلی کے ساتھ
 کرنا چاہیے۔

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حَبِيبٍ ذَوِي الشُّرْبَىٰ
 وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ
 وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ (البقرہ - ۱۷۷)
 اور اس کی محبت پر مال دے رشتہ داروں
 کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو
 اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے والوں کو۔

یہ آسمانی ہدایت پہلی نبوتوں کے دور سے چلی آرہی ہے:

اور اللہ نے ان میں بارہ سردار مقرر کیے اور اللہ نے کہا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم رکھو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی بدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح کا قرض دو گے تو میں البتہ دور کردوں گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں پھر اس کے بعد تم میں سے جو کوئی کافر ہو تو وہ بے شک سیدھے راستے سے گمراہ ہوا۔

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَعَزَرْتُمْ أَوْلِيَاءَكُمْ لَأُقْرِضَنَّكُمْ اللَّهُ قَرْضًا حَسَنًا لَّا كُفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَا ذُخِّلَنَّكُمْ جَنَابًا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ۔

(المائدہ - ۱۲)

خرچ کی صلاحیت رکھنے والوں پر برابر خرچ کرتے رہنے کی ذمہ داری دو باتوں کی وجہ سے ہے:

- ۱۔ اللہ کی مخلوق میں کمزور لوگوں کی نگہداشت — چاہے اس میں جتنا بھی خرچ ہو جائے — کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول۔
- ۲۔ معاشرہ کو کینہ اور غصہ و انتقام کے جذبات سے محفوظ رکھنا، جو سخیل اور دوسروں کی تکلیفیں نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتا ہے کہ اس خرچ کا انجام آخرت کی ضمانت کے ساتھ دنیا کی ضمانت اور برافروختہ لوگوں کی آتش غضب سے دولت کا تحفظ بھی ہے۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال رات کو اور دن کو اور چھپا کر اور ظاہر میں خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا ثواب ہے اور ان پر نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (البقرہ - ۲۷۳)

ہوں گے۔

اور تم جو کچھ مال خرچ کرو گے وہ اپنے ہی
واسطے کرو گے جب تک کہ اللہ کی رضا جوئی
میں خرچ کرو گے۔

وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ نَلَا نَفْسِكُمْ وَمَا
تَنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ

(البقرہ - ۲۷۲)

سنتے ہو، لوگ تم کو بلاتے ہیں کہ اللہ کی راہ
میں خرچ کرو پھر تم میں سے کوئی ایسا ہے
کہ نہیں دیتا اور جو کوئی نہ دے گا وہ اپنے آپ
کو نہ دے گا اور اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج

هَآءَ أَنْتُمْ هُوَ لَا تَدْعُونَ لِنَفْسِكُمْ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخُلُ وَمَنْ
يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلْ عَنِ نَفْسِهِ
وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ

(محمد - ۳۸) ہو۔

اسلام نے جو زکوٰۃ فرض کی ہے وہ ہے:

بغیر خرچ کے (بارانی) کھیتی کی پیداوار کا دسواں حصہ۔

خرچ والی (غیر بارانی) کھیتی کی پیداوار کا بیسواں حصہ۔

نقدی اور سامان تجارت کا چالیسواں حصہ۔

اور سونے چاندی اور مولیشیوں وغیرہ کا مقررہ حصہ

حج

اسلام اور خانہ کعبہ کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اور ہر صاحب استطاعت پر خدا کے اس گھر کی تعظیم کے لیے زیارت کیوں فرض کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی باتیں حج کو یہ اہم مقام دیتی ہیں۔

خانہ کعبہ روئے زمین کی پہلی مسجد ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تعمیر کی گئی۔ اس کی تعمیر توحید کے جھنڈے کی سر بلندی کی علامت ہے اور اس کے مہمار دو معزز بنی ہیں ایک کوبتوں کی پرستش کی مخالفت کی وجہ سے آگ میں ڈالا گیا یعنی حضرت ابراہیمؑ۔

رَبِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَحَاجَّهٖ قَوْمُهٗ قَالَ اَتَّحٰجُّوْنِیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰ اِنِ -

میں نے اپنا رخ اس کی طرف کر لیا جس نے بنائے آسمان اور زمین، سب سے سیکو ہو کر اور میں شرک کرنے والا نہیں ہوں اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا تو وہ بولا کیا تم مجھ سے اللہ کے ایک ہونے میں جھگڑا کرتے ہو جبکہ

وہ مجھے راستہ دکھا چکا۔ (الانعام۔ ۷۹-۸۰)

اور دوسرے حضرت اسماعیلؑ ہیں جنہوں نے اس وقت اپنی گردن قربانی کے لیے پیش کر دی جب ان کے والد (حضرت ابراہیمؑ) نے ان سے کہا کہ مجھے تمہیں قربان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

يَا أَيَّتُهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَاتُوا مُرْسِدًا بِنِي
إِنشَاءَ اللَّهِ مِنَ الصَّابِرِينَ -

(الصافات - ۱۰۲)

انہیں دونوں، اللہ تعالیٰ کے مخلص و جانثار نبیوں، نے خانہ کعبہ کی عمارت کھڑی کی
تاکہ اہل ایمان اس میں نماز پڑھ سکیں۔

جس مسجد کی بنیاد یہ ہو اس کی اہمیت اور مرتبہ بالکل واضح ہے۔

پھر امتِ اسلامیہ اس دعا کا جواب ہے جو اس کی تعمیر کے دوران کی گئی تھی۔

اور یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانہ کعبہ
کی بنیادیں اٹھاتے تھے اور دعا کرتے تھے

اے پروردگار ہم سے قبول کر، بیشک تو ہی

سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار

ہم کو اپنا حکم بردار بنا اور ہماری اولاد میں بھی

اپنی فرماں بردار ایک جماعت بنا اور ہمیں

حج کرنے کے قاعدے بتا اور ہم کو معاف کر

بیشک تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

اور اے پروردگار ان میں ایک رسول انہیں

میں سے بھیج کہ ان پر نیری آیتیں پڑھے اور

انہیں کتاب اور شہ کی باتیں سکھائے اور

انہیں پاک کرے۔ بے شک تو ہی زبردست

بڑی حکمت والا ہے۔

ظاہر ہے یہ یادگار زندہ رکھنے اور احترام کرنے کے لائق ہے۔

اس مسجد کی تعمیر کے ساتھ آنے والوں کے لیے جو دعائیں کی گئی تھیں، کون جانتا

ہے کہ ہماری ہدایت انہیں کی برکت سے ہو اور اس کا شکر یہ ادا کیسے ہو سکتا ہے؟

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ
مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ
مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنَ
ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَّكَ
وَارِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبِّ عَلَيْنَا إِنَّكَ
أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ رَبَّنَا
وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ
يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ -

(البقرة - ۱۲۷ - ۱۲۹)

پھر نماز جو اولین علی عبادت ہے اسی خانہ خدا کے ساتھ مربوط ہے مسلمان جب قیام و رکوع و سجود کی حالتوں میں ہوتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی ہے اور اسی کی حمد و ثنا اور بزرگی بیان کر رہا ہے اور اگرچہ معنوی و مادی اعتبار سے سب کمیتیں برابر ہیں ان میں کسی کا احترام مقصود نہیں، تاہم اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ سارے براعظموں میں پھیلی ہوئی امت، روئے زمین کی اس اولین مسجد ہی کو اپنا قبلہ بنائے اور اس طرح امت اسلامیہ کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مربوط کر کے یہ واضح کر دے کہ وہ سابقہ نبوتوں کی بنیادوں سے جڑی ہوئی ہے۔ اس سے الگ تھلگ نہیں۔ الگ تھلگ تو وہ لوگ ہوئے جنہوں نے شرک اور بگاڑ کا راستہ اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور گمراہی کے مستحق ہوئے۔

اسی لیے قرآن میں آتا ہے:

اور تم جس جگہ سے نکلو اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف کرو اور بے شک تمہارے رب کی طرف سے یہی حق ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خیر نہیں اور تم جہاں سے نکلو مسجد الحرام کی طرف اپنا منہ کرو اور تم جس جگہ ہو اسی کی طرف منہ کرو تاکہ لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع نہ رہے، سوائے ان کے جو ان میں سے بے انصاف ہیں سوان سے نہ ڈرو اور مجھ کے ڈرو اور اس واسطے کہ تم پر اپنا فضل کامل کروں اور تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَارْتَمِعُوا بَيْنَ يَدَيْكُمْ وَعَلَيْكُمْ تَقَدُّونَ - (البقرة ۱۴۹)



انہیں تاریخی و روحانی روبا بط کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ پر یہ فریضہ

کیا کہ جو بھی استطاعت رکھے وہ عمر میں ایک بار اس مسجد کی زیارت ضرور کرے اور اس کے لیے دل آویز ہدایات دیں جن کا مقصد ایمان و یقین کے احساسات کو بیدار کرنا اور پروردگارِ عالم کے لیے اخلاص کے جذبات کو فروغ دینا ہے۔ حج کرنے والا جو کلمات منہ سے ادا کرتا ہے ان سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے

لَبَيْتِكَ اللَّهُمَّ لَبَيْتِكَ ، لَبَيْتِكَ لَا
حاضر ہوں اے میرے اللہ، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
شَرِيكَ لَكَ لَبَيْتِكَ (بخاری)
ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔
یہ گویا اس پکار کا جواب ہے جس کی گونج صدیاں گزرنے کے بعد بھی ماند نہیں پڑی۔
وہ پکار جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم پر وحی فرمائی تھی:

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
الَّذِي شَرِكُ بِي شَيْئًا وَطَهَّرَ بَيْتِي
لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ
السُّجُودِ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ
يَا أُولِي الْأَلْبَابِ وَالْعَالِي كُلِّ ضَامِرٍ
يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۔
(الحج - ۲۶ - ۲۷)

اور جب ہم نے ابراہیم کو اس گھر کی جگہ ٹھیک
کر دی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور
میرا گھر پاک رکھ طواف کرنے والوں، کھڑے
رہنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں
کے واسطے۔ اور لوگوں میں پکار دے کہ تیری۔
طرف حج کے واسطے آئیں بیروں چل کر اور
دبلے دبلے اونٹوں پر سوار ہو کر دور رہا ہوں
سے چلے آئیں۔

جی ہاں! لوگ اسی پکار پر لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں اور پوری کائنات اس میں
شریک ہو کر اپنے رب کی پاکی بیان کرتی ہے۔ گویا یہ بنجر خطہ اچانک ایک
منظاہرے میں تبدیل ہو جاتا ہے جو ذکر و شکر اور حمد و ثنا کے نعرے لگا رہا ہوتا ہے۔
حدیث میں آتا ہے کہ:

کوئی لبیک کہنے والا جب لبیک کہتا ہے تو اس کے دائیں بائیں ہر طرف سے
تمام شجر و حجر و غیرہ بھی لبیک کہنے لگتے ہیں۔ (ترمذی)
حج کا پورا موسم عبادت، تخریب، اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ، اس کی حمد و ثنا اور

غیر اللہ سے بالکل بے نیازی و بے توجہی کا موسم ہوتا ہے۔

حج کے چند معلوم پہننے ہیں پھر جس نے ان میں
حج لازم کر لیا تو حج کے زمانہ میں جائز نہیں
عورت سے بے حجاب ہونا اور نہ گناہ کرنا
اور نہ جھگڑا کرنا اور جو کچھ نیکی تم کرتے ہو اللہ اس
کو جانتا ہے اور زادِ راہ لے لیا کرو کہ بہترین زادِ راہ
(سوال سے) بچنا ہے اور اے عقلمند بندو! مجھ سے
الاباب۔

ڈرتے رہو۔

(البقرہ - ۱۹۷)



حج کے مناسک کوئی پیچیدہ چیز نہیں۔ ہر ذی الحجہ کو میدانِ عرفات میں مغرب تک
جمع ہونا اور پھر خانہ کعبہ کا طواف کرنا ہی حج کے اہم ارکان ہیں۔
ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں ہیں۔ مثلاً مکہ مکرمہ پہنچنے پر خانہ کعبہ کا طواف، حمرات میں
کنکری مارنا، صفا و مروہ کے درمیان سعی اور قربانی۔
کچھ لوگوں نے حج کے مناسک کو جتنا دشوار گزار سمجھ رکھا ہے وہ غلط ہے حج تو ایک
پر لطف روحانی سفر کا نام ہے۔
اسلام کی عقلی بنیاد کے ساتھ اس پر تاریخی یادوں کے پس منظر میں دلی جذبات
بیدار کرنے کے لیے۔

اسلام میں حج کی ابتدا ہی سے اس موقع کو اہم مسائل پر تبادلہ خیال اور عام رہنمائی
کے لیے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

۹ ہجری میں حج کے دوران مشرکین کے ساتھ ان معاہدوں کو باطل قرار دیا گیا جن
کی پابندی ایک طرف طور پر صرف مسلمانوں پر واجب تھی طاقت و مشرکین اکثر انھیں
پامال کرتے رہتے تھے۔

حجۃ اوداع میں انسانوں کے ایک جم غفیر کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے جو خطبہ دیا تھا وہ انسانی حقوق اور قوموں کی آزادیوں کا منشور ہے، ان سے برتر اصول اور بہتر مقاصد آج تک کبھی کانوں کو سننے کو نہیں ملے۔

حج کو مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع کی صورت میں برقرار رہنا ہی چاہیے تاکہ ایک مقرر وقت اور جگہ میں دنیا کے تمام گوشوں سے آئے ہوئے موحدا اللہ تعالیٰ کو یاد کریں اور شیطان کو مسترد کریں۔

بڑے اور چھوٹے گناہ

جن بڑے گناہوں کے سلسلے میں اسلام نے شدت برتی ہے وہ بہت سے ہیں۔ بڑے گناہ (کبیرہ) وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں آخرت کے شدید عذاب یا دنیا میں سخت سزا کی وعید آئی ہے مثلاً:

حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہ نہ بتا دوں؟ (آپ نے تین بار ایسا فرمایا) ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کے ساتھ قطع تعلق اور ان کی حق تلفی کرنا اور کسی جان کو مار ڈالنا۔

(آپ ٹیک لگاتے ہوئے تھے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھے پھر فرمایا)

ہاں: اور چھوٹی بات کہنا اور چھوٹی گواہی دینا۔

آپ اٹھے برابر دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم نے دل میں سوچا کہ کاش آپ

سکوت فرمالتے۔" (بخاری)

حضرت عبید بن عمیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے کبیرہ گناہوں کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: "یہ نو ہیں: شرک، جادو کرنا، جان مار ڈالنا، سووکھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن پیٹھ دکھانا، پاکباز عورتوں پر تہمت لگانا، والدین سے قطع تعلق کرنا اور ان کے حقوق ادا نہ کرنا اور بیت اللہ کی حرمت کو پامال

کرنا جبکہ اسے زندہ و مردہ دونوں صورتوں میں تمہارا قبلہ بنایا گیا ہے۔ (ابوداؤد)
 حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ بات کرے گا اور ان کی
 طرف دیکھے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: زنا کار بوزھا، جھوٹا بادشاہ اور
 گھمنڈی سربراہ خاندان۔“ (مسلم)



کچھ حالات ایسے ہوتے ہیں جن میں گناہ کی شدت اور سنگینی بڑھ جاتی ہے۔
 مثلاً بے آبروی کرنا بڑی بُرائی ہے لیکن یہی بُرائی اگر پڑوسی کی عورت یا میدان جنگ
 میں جانے والے فوجی کی عورت کے ساتھ کی جائے تو کہیں زیادہ سنگین اور انجام
 کے اعتبار سے زیادہ تباہ کن ہو جاتی ہے۔

حضرت مقداد بن اسود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 صحابہؓ سے دریافت فرمایا:

”زنا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

انہوں نے عرض کیا: حرام ہے کیونکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے قیامت تک
 کے لیے اسے حرام قرار دیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: اگر آدمی دس عورتوں کے ساتھ زنا کا گناہ کر بیٹھے تو بھی یہ اس سے
 کم سنگین ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عورت کے ساتھ زنا کرے۔ (احمد)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرنے والے شخص کی طرف قیامت کے
 دن اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ اسے پاک کرے گا بلکہ فرمائے گا کہ جہنمیوں کے ساتھ
 جہنم میں داخل ہو جاؤ۔“ (ابن ابی الدنیا)

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”مجاہدین کی عورتوں کی حرمت (جہاد میں) شرکت نہ کرنے والے پر ویسی ہی

ہے جیسے ان کی ماؤں کی حرمت۔
ایسا شخص جو کسی مجاہد کے گھر والوں کی نگہداشت کی ذمہ داری لے اور پھر
اس کی خیانت کرے تو قیامت کے دن اسے کھرا کیا جائے گا اور (مجاہد سے) کہا
جائے گا کہ اس کی نیکیوں میں سے جتنی چاہو لے لو۔
تو کیا وہ تمہارے خیال میں اس کی نیکیوں میں سے کچھ بھی چھوڑ دے گا؟ (مسلم و نسائی)
اسی طرح ناواقف کے مقابلے میں جانے والے کا جرم زیادہ سنگین مانا جائے گا
کیونکہ وہ جان بوجھ کر برائی کر رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں اسی طرف اشارہ ہے؛
”اے میرے پروردگار میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو بے فائدہ ہو
اس دل سے جس میں ڈرنہ ہو، اس پیٹ سے جو سیر نہ ہو اور اس آنکھ سے جو آنسو نہ
بہائے۔“ (ترمذی)

بامقصد معاشرہ

امتِ اسلامیہ کا ایک خاص رنگ اور ممتاز طرزِ عمل ہے۔ وہ لوگوں کا کوئی ایسا گروہ نہیں جسے زندگی کی ضرورتوں اور مفادات نے بچا کر دیا ہو۔

اسلام ایک قدیم نام ہے جس کا خاص مفہوم ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر جاری ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کر لیا تھا
 مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ ۙ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۗ رَاجِعْ ۙ (۷۸)

تمہارے باپ ابراہیم کا دین انہیں نے پہلے سے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے یہ نام تجویز کیا تھا تو کوئی نئی ایجاد نہیں فرمائی تھی بلکہ ایک قدیم حقیقت کا اثبات کیا تھا۔ یہ فطرتِ الہی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا فرمایا تھا اور جس کی طرف ان سے پہلے انبیاء و عوت دیتے رہے تھے۔

حضرت نوحؑ اس سے پہلے کہہ چکے تھے:

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ
 مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيْ اِلَّا عَلٰى اللّٰهِ
 وَاَهْرٰتٌ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

پھر اگر تم منہ پھرتے ہو تو میں نے تم سے
 تو کوئی اجر چاہا نہیں میرا اجر تو اللہ پر ہے
 اور مجھ کو حکم ہے کہ فرماں بردار رہوں۔

(یونس - ۷۲)

حضرت نوح کے حق پر اس اصرار اور ثابت قدمی پر حضرت ابراہیم کی پسندیدگی ہی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی مطلوبہ امت کا نام مسلم رکھا تاکہ حضرت نوح ماضی میں جس بات پر زور دے چکے تھے مستقبل میں بھی اسے دوام حاصل رہے۔

اس طرح یہ امت تمام انبیاء کی وارث اور ان سب کی تعلیمات کی نمائندہ ہے ازل سے ابد تک دنیا اور اس کے پروردگار کے درمیان تعلق کی نوعیت نہیں بدل سکتی نہ کبھی اپنے عظیم پروردگار کے ساتھ لوگوں کے ربط کی نوعیت بدل سکتی ہے۔ اسلام اسی شعار اور اس سے متعلق اخلاص و اطاعت کا نام ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ بے شک اللہ کے یہاں دین تو یہی اسلام ہے۔

(آل عمران - ۱۹)

یہ عنوان قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔

اور مسلمانوں کی ذمے داری یہ ہے کہ:

اولین حقائق کو دوسروں تک پہنچائیں۔

اور ان حقائق کو تخریب اور بگاڑ سے محفوظ رکھیں۔

نبیوں نے جو کچھ اس انسانیت کو پہنایا تھا وہ زمانے کے گزرنے کے باوجود

نہیں بدلا۔

ہاں کبھی کبھی وہ گندا ہو جاتا ہے یا کمزور ہو جانے کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے۔

وقت اصولوں کو دائیں بائیں موڑنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

حضرت محمد سے پہلے بہت سے نبی آئے جو حق کو روشن رکھنے کی جدوجہد کرتے

رہے کہ حق جعل سازیوں کا شکار نہ ہو جائے۔

کچھ لوگ شرک کو ایمان، برائی کو بھلائی نہ بنانے لگیں۔

دوسرے کچھ لوگ اپنے آپ پر ظلم نہ کرنے لگیں اور خوشگوار زندگی کے حق سے

محروم کر کے اپنے جسم و روح کو عذاب میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے

کی کوشش نہ کرنے لگیں۔

ایسی حالتوں میں کس طرح وہ کسی ایسے شخص کے ضرورت مند نہ ہوں گے جو:

يَا مَرْهُمُ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ
عَنْهُمْ اَصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِي
كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (الاعراف۔ ۱۵۷) بوجھ اور وہ قید میں جو ان پر تھیں۔

ایسا شخص جو راہ کے ان نشانوں کو اجاگر کرے جنہیں بھول اور سرکشی کی ہواؤں نے دھندلا کر دیا یا مٹا دیا ہو۔

مسلمانوں کو کبھی اس بات پر افسوس نہیں ہوا نہ ہو ہی سکتا ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰ کی پیروی کی یا عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کی پیروی کی۔ اس طرح کا احاس بھی ان کے لیے خدا اور اس کے رسول سے غداری کے برابر ہے۔

انہیں تو افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اس پیغام الہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے لے کر آئے تھے اور خود اپنی اصلاح اور دنیا کی اصلاح کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کنارہ کشی کے بعد یہ بات فطری تھی کہ اللہ تعالیٰ زمین کو ایسے لوگوں کی ذمہ داری میں چھوڑ کر انار کی کے حوالے نہ کر دے جنہوں نے ہدایات کو ماننے سے انکار کر دیا ہو۔

اسی لیے اسلام کی ضرورت پیش آئی اور اسی لیے امت اسلامیہ کا وجود ہوا جو شب و روز کی گردش کے ساتھ باقی رہے گا۔

جو خصوصیت اس امت کا امتیاز ہے اور جس کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت کی مستحق ہو سکتی ہے وہ دین کی حقائق کی اشاعت، اللہ تعالیٰ کے حدود کا تحفظ، بھلائی کو بھلائی کی حیثیت سے اور برائی کو برائی کی حیثیت سے برقرار رکھنا ہے۔

اور یہ خصوصیت امت کو لوگوں کے درمیان ویسا ہی امتیاز عطا کرتی ہے جیسا امتیازی مرتبہ خود ان کے مقابلے میں ان کے رسول کو حاصل ہے۔
 جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کو پوری طرح واضح فرمادیا اور آخر میں یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ تو گواہ رہنا کہ میں نے پیغام پہنچا دیا ہے اسی طرح امت پر بھی حق کی وضاحت، اسی سے نسبت اور اسی کے لیے اور اسی پر جینے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

امتِ اسلامیہ کا ایک مقصد اور پیغام ہے :

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ
 هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ
 مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ
 هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ
 وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا
 عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ
 اور اللہ کے واسطے ویسی ہی محنت کرو جیسی
 کہ چاہیے۔ اس نے تم کو پسند کیا اور دین میں
 تم پر کچھ مشکل نہیں رکھی۔ تمہارے باپ کا
 دین اسی نے تمہارا نام پہلے سے مسلمان
 رکھا اور اس قرآن میں تاکہ رسول تم پر بتانے
 والا ہو اور تم لوگوں پر بتانے والے۔

(الحج - ۷۸)

وَكذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا
 لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ
 اور اس طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا
 تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو۔

(البقرة - ۱۴۳)

اور لوگوں پر گواہی کیا ہے۔ دین کی امانت سے عہدہ برآ ہونا اور اس کے عقائد، عبادات اور اخلاق و معاملات کو لوگوں تک پہنچانا۔

بہت سے ممالک رسولوں کے پیغامات سے دور ہیں۔

کچھ کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو بظاہر نسبت رکھتے ہیں اور باطن دشمنی۔

لیکن امتِ اسلامیہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ظاہر و باطن دونوں طرح

اللہ تعالیٰ سے نسبت کو اپنے لیے عزت کا ذریعہ بنائے اور اللہ تعالیٰ کے قوانین کو زندہ کرنے کے لیے کوشاں رہے۔

حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”مسلمانوں اور یہودیوں اور عیسائیوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ لوگوں کو ایک مقررہ اجرت پر رات تک کام کے لیے رکھے۔ وہ لوگ دوپہر تک کام کرنے کے بعد کہتے لگیں ہمیں تمہاری اجرت کی ضرورت نہیں جتنا کام ہم کر چکے ہیں اس کی اجرت نہیں مانگتے (لیکن اب کام نہیں کریں گے)۔ وہ شخص کہے: ایسا نہ کرو اپنا کام پورا کر لو اور پوری اجرت لے لو۔ لیکن وہ نہ مانیں اور کام چھوڑ کر چلے جائیں۔

اس کے بعد وہ شخص کچھ دوسرے لوگوں کو اجرت پر رکھے اور کہے کہ اب جتنا دن بچا ہے اتنا کام کر لو تمہیں پوری وہی اجرت ملے گی جو پہلے کے لوگوں سے ملے تھی، وہ لوگ عصر تک کام کرنے کے بعد کہیں: تم اپنی اجرت اپنے پاس رہنے دو اب تک جتنا کام ہم کر چکے ہیں اس کی اجرت بھی نہیں مانگتے (لیکن اب کام نہیں کریں گے) وہ شخص کہے: اپنا باقی کام پورا کر لو بس تھوڑا سا دن ہی تو باقی رہ گیا ہے۔ لیکن وہ نہ مانیں۔

تب وہ شخص کچھ دوسرے لوگوں کو اجرت پر رکھے جو شام تک کام کریں اور جب سورج ڈوب جائے تو پہلے کے مزدوروں کی پوری اجرت بھی انہیں مل جائے۔

ان لوگوں (یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں) کی اور جتنی روشنی انہوں نے قبول کی اس کی مثال ایسی ہی ہے۔“ (بخاری)

صورتِ حال کتنی واضح ہو جاتی ہے۔

یہودیوں کو توریت دی گئی کہ وہ اس پر عمل کریں اور اس میں جو حق نازل کیا گیا ہے اسی کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان فیصلے کریں۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ
 نَبِّحُكُمْ بِهَا النَّبِيِّونَ الَّذِينَ اسْلَمُوا
 لِّلَّذِينَ هَادُوا۔ (المائدة - ۴۴)
 ہم نے توریت نازل کی کہ اس میں ہدایت اور روشنی تھی اسی پر حکم بردار پیغمبر حکم کرتے تھے یہود کو۔

اسی طرح عیسائیوں کو انجیل دی گئی کہ وہ اس پر خود بھی عمل کریں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس پر اکٹھا کریں۔

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَىٰ بْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ

اور انھیں کے قدموں پر ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا آگے سے موجود تورات کی تصدیق کرنے والا بنا کر اور ان کو ہم نے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔

المائدۃ - ۱۲۶

یہ چراغ بہت جلد ان کے ہاتھوں میں بکھ گیا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں نے اپنے عہد کے ساتھ وفاداری بھائی نہ بہت دنوں تک اپنے پیغام کی دے داری اٹھائی۔

امتیں اپنے پیغام سے ہاتھ دھولیتی ہیں جب ہدایت پر خواہشاتِ نفس کو غالب ہو جانے دیتی ہیں اور باطل کو اس کا موقع دے دیتی ہیں کہ وہ حق کو شکست دے دے ان کی (آسمانی) کتابیں ان کے پاس رہتی ہیں لیکن وہ بالکل معطل ہو کر طاق کی زینت بن کر، جیسے اقوامِ مستحجرہ کے منشور کو بڑی دقیقہ سنجی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا لیکن عملی طور پر بار بار اس کی خلاف ورزی ہوتی رہتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باطل، تحریف و تفسیح و اضافہ کے راستوں سے خود ان کتابوں کی اصل عبارتوں میں داخل ہو جاتا ہے ایسی صورت میں حالت بالکل قابلہ سے باہر نکل جاتی ہے۔ گویا وہ شمعیں ہی گھل کر دی گئی ہوں اور اندھیرا بالکل مسلط ہو گیا ہو۔

تب دنیا کے سامنے سوائے پرگندہ خیالی اور پریشان حالی کے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہ جاتا۔

حقیقت یہی ہے کہ حضرت موسیٰ کا دین کب کا ضائع کیا جا چکا اب اس کی جگہ جو کچھ ہے وہ کوئی اور ہی چیز ہے۔

کیا صیونیت کا کوئی تعلق بنو نوح سے ہو سکتا ہے؟

یہی صورت حال حضرت عیسیٰ کے دین کے ساتھ بھی ہے۔

آج مسیحی دین کے نام پر جو کچھ بچا کھچا پایا جاتا ہے اس کا کوئی تعلق وحی الہی سے نہیں ہے نہ اس سے انسانوں کی خوش بختی ممکن ہے۔ اس مذہب کے لوگ اپنی اولین ذمے داری سے کنارہ کش ہو چکے اور وحی الہی سے بیٹھ پھر چکے۔

تب دنیا کو ایک نئی رسالت کی ضرورت ہوئی جس کے علمبردار از سر نو لوگوں کی ہدایت کا فریضہ سنبھالیں، اللہ کے نام پر ان کی رہنمائی کریں اور اس کام کو مکمل کریں جسے پایہ تکمیل تک پہنچانے سے اگلے لوگوں نے انکار کر دیا۔
امت اسلامیہ اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔

وہ جس حق کی علمبردار ہے اسے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے جب تک روئے ارض پر زندگی باقی ہے ایمان کے حقائق اور حکمت عالیہ کے مقررہ طریقوں میں کوئی تبدیلی اور خلل پیدا نہیں ہو سکتا۔

اگر کچھ لوگ اس ذمے داری کو نبھانے سے انکار بھی کرتے ہیں تب بھی اہل قرآن ایسی غلطی نہیں کر سکتے نہ اس طرح کی کسی غلطی کو برداشت کر سکتے ہیں۔
پچھلے زمانوں کی طرح شیطان کو اب حق کے نشانات کو مٹانے کا موقع نہیں مل سکتا۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”پچھلی امتوں کے مقابلے میں روئے ارض پر تمہاری بقا کی مدت ایسی ہی ہے جیسے عصر سے مغرب تک۔“

اہل توریت کو توریت دی گئی تو انھوں نے دو پہر تک اس پر عمل کیا پھر رک گئے انھیں ایک ایک قیراط کے برابر اجرت دی گئی۔
پھر اہل انجیل کو انجیل دی گئی تو انھوں نے عصر کے وقت تک کام کیا پھر رک گئے۔ انھیں بھی ایک ایک قیراط کے برابر اجرت دی گئی۔

پھر ہمیں قرآن دیا گیا تو ہم نے سورج ڈوبنے تک کام کیا اور ہمیں دو دو قیراط کے برابر اجرت دی گئی۔

توریت اور انجیل والوں نے عرض کیا: اے پروردگار! آپ نے انہیں دو دو قیراط کے برابر اجرت دی اور ہمیں ایک ایک قیراط کے برابر جبکہ ہم نے زیادہ کام کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا میں نے تمہاری اجرت کے سلسلے میں کوئی ظلم کیا؟ انہوں نے عرض کیا: نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تو میرا فضل ہے جسے چاہوں دوں“ (بخاری)

کیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طرفداری ہے؟ ہرگز نہیں، یہ تو کام کی ذمے داری ہے جس نے اپنی ذمے داری پوری نہیں کی اسے زیادہ اجرت کیسے مل سکتی ہے؟

امت اسلامیہ محض اللہ تعالیٰ سے نسبت کی زبانی دعویٰ نہیں۔

یہ امت صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتی ہے اور بس۔

یہ امت خوشحالی و تنگدستی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی طرف رجوع نہیں کرتی۔

یہ امت حکم الہی کی پیروی کا ہے اسی کے مطابق زندگی گزارتی ہے۔

یہ امت اپنے باطن کو تقویٰ سے، اپنے سلوک و معاملہ کو عدل و انصاف سے اور

اپنے مقاصد کو آخرت کے حقائق سے ہم آہنگ و مزین کرتی ہے۔

اسی امت کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرے۔

اگر کوئی تہذیب اس میں کامیاب ہو جائے کہ وہ دنیا کو ایسے محلوں سے بھر دے

جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں پھر اس کے باشندے اپنے پروردگار کی تنظیم نہ کریں، اس

سے ملاقات کی تیاری نہ کریں، اس کی حمد و ثنا نہ کریں اور اس کی بزرگی کے آگے سر تسلیم خم

نہ کریں تو ایسی تہذیب بے قیمت ہوگی اور ذرہ برابر احترام کی حقدار نہیں ہوگی۔

بہت سی قوموں نے اللہ تعالیٰ سے نسبت کا دعویٰ کیا لیکن دنیا پرستی سے کنارہ کشی

نہیں اختیار کی نہ طلب آخرت کی کوشاں ہوئیں اور نہ اس کے لیے تواضع، بھلائی اور اصلاح

کاراستہ اپنایا۔ تو ان کا انجام کیا ہوا؟

اس نسبت کو مسترد کر دیا گیا اور جس سزا کے وہ مستحق تھے وہ ان پر نازل ہوئی۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ
أَبْنَاؤُ اللَّهِ وَآخِيَاءُهُ قُلْ نَسِئَمُ
يَعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ
بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ
وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَلِلَّهِ
مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ۔
(المائدة - ۱۸)

اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے
اور اس کے پیارے ہیں تو کہو کہ پھر وہ
کیوں تمہارے گناہوں پر تم کو عذاب دیتا
ہے۔ کوئی نہیں بلکہ تم بھی اس کی مخلوق میں
ایک آدمی ہو وہ جس کو چاہے بخشنے اور جس
کو چاہے عذاب دے اور اللہ ہی کے لیے
آسمانوں اور زمین اور جو کچھ دونوں کے بیچ
میں ہے اس کی سلطنت ہے اور اسی کی

طرف لوٹ کر جانا ہے۔

امتِ اسلامیہ کبھی الہی ہدایت سے کنارہ کشی نہیں اختیار کر سکتی۔

اس لیے رسالت کے ساتھ اس کی نسبت کی عزت برقرار رہے گی۔ اور جب
تک وہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص رہے گی، اس کی حمد و ثنا کرتی رہے گی اور اپنے اعمال
سے اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے کوشاں رہے گی وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ سے نہیں
گرے گی۔

اس امت کی کتاب قرآن کریم کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے اس میں کوئی
تحریف نہیں ہو سکتی۔

سنتِ نبویہ میں اس کی تشریح و تفسیر موجود ہے اور علماء اس کا مطالعہ کرتے
رہتے ہیں۔

یہ تو نظریاتی پہلو ہے۔ عملی اعتبار سے کسی بھی علاقہ اور زمانہ میں امتِ زندگی
کو حق کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور اس کے تابع کرنے سے بالکل کنارہ کش نہیں ہوتی۔
خرافات و اوهام پھیل سکتے ہیں، گناہ اور ظلم کا صدور ہو سکتا ہے اور یہ زندگی

میں کوئی انوکھی بات نہیں لیکن اہل ایمان ان کی مزاحمت کر کے تلافی کرتے رہتے ہیں جس سے یا تو ان کا بالکل قلع قمع ہو جاتا ہے یا کم از کم ان کی برائی محدود ہو جاتی ہے۔ کبھی ایک علاقہ میں ان کوششوں کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے تو کسی دوسرے علاقہ میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔

کبھی کسی وقت پیچھے ہٹنا پڑتا ہے تو دوسرے وقت پیش قدمی حاصل ہو جاتی ہے۔ کتاب وحی میں موجود حق اور جہد و جہد کرنے والوں کی زندگی میں اس کے اثرات کی آگ بالکل کبھی نہیں بجھتی۔

حدیث میں آتا ہے:

”میری امت کے کچھ لوگ حق پر قائم رہیں گے یہاں تک کہ اسی حال میں انٹر کا حکم (قیامت) آجائے“ (مسلم)

حق پر قائم رہنا صرف بلیغ تقریروں اور بہترین کتابوں ہی میں نہیں ہوتا اس کا اظہار حالات اور اعمال میں اور ہدایت الہی کے مطابق معاشرے کی تشکیل اور اس کے خاص و عام معاملات میں ہوتا ہے۔

اسلام کسی ایسی امت کا عنوان نہیں ہو سکتا جو سستی کا شکار یا سرکش ہو یا جو زندگی میں اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے طرز عمل اور غلط رخ اختیار کرے اسلام تو دل کی گہرائیوں اور معاشرے کے گوشے گوشے میں نمایاں ان حقائق کا نام ہے جو دن رات اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتے ہیں، اس کی فرماں برداری پر زور دیتے ہیں، اس سے ڈرنے پر آمادہ کرتے ہیں اور اس کے لیے اخلاص پر ابھارتے ہیں۔

مرد و عورت کی باہمی زندگی

کیا جنسی ضرورت ایک شیطانی عمل ہے؟
 کچھ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل کرنے کے لیے اس ضرورت کے تقاضوں کو دینا ضروری ہے۔
 اس لیے رہبانیت کو انسانی سر بلندی کا ایک بڑا درجہ اور اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کوشش کا ایک بڑا ثبوت مانتے ہیں۔
 اسلام اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے نتائج کو کئی طور پر مسترد کرتا ہے وہ دینِ فطرت ہے، وہ انسانی فطرت کا تحفظ کرتا ہے اسے مٹانا نہیں۔ وہ جنسی رجحان کو ایسا ہی سمجھتا ہے جیسے معدہ کی رغبت کھانے کی طرف۔
 اس رغبت کا انکار نہیں کیا جاسکتا البتہ اس کی تکمیل کے لیے کچھ باتوں کا لحاظ ضروری ہے مثلاً یہ کہ کھانا حلال و پاک ہو، حرام و ناپاک نہ ہو۔
 کھانا حاصل کرنے کی انسانی کوشش قابل فہم ہے لیکن اس پر اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے کہ وہ مثلاً مرد و خون اور خنزیر وغیرہ نہ کھائے۔
 اور یہ بھی اللہ کا حق ہے کہ وہ جائز چیزوں کو ناجائز طریقوں مثلاً چوری، دیکتی، رشوت اور فریب دہی وغیرہ سے نہ حاصل کرے۔
 یہی صورت جنسی ضرورت کے ساتھ بھی ہے۔
 اسلام اس کے تقاضوں سے انکار نہیں کرتا اور نہ لوگوں کو منع کرتا ہے کہ وہ یہ

تقاضے پورے کریں البتہ اس کے لیے کچھ حدود مقرر کرتا ہے۔
 اگر حلال و پاک ذریعے سے یہ ضرورت پوری ہو تو پھر کوئی خرچ باقی نہیں رہتا۔
 جس طرح اللہ کا نام لے کر انسان کھانا کھاتا ہے اسی طرح اس کا نام لے کر
 اپنی بیوی کے ساتھ ضرورت بھی پوری کرتا ہے۔

نیک نیتی کے ساتھ یہ عام کام شہوت کے بجائے عبادت بن جاتے ہیں۔
 مسلم فقہاء نکاح کو اطاعتوں میں شمار کرتے ہیں اور زکاۃ و حج کے بعد ہی اس
 کے احکام کا باب قائم کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کچھ لوگوں نے رہبانیت کو دین اور
 شادی سے گریز کو عبادت بنانے کی کوشش کی۔ غالباً دوسرے مذاہب سے
 متاثر ہو کر یہ رجحان ہوا تھا۔ تو جب یہ خبر آپ کے پاس پہنچی تو آپ نے اسے سختی
 سے مہر د کر دیا کیونکہ یہ مسلک ہم کے فطری تقاضوں کے خلاف تھا۔

اور اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ یہ ایک پوشیدہ شدید خواہش کے خلاف جدوجہد
 ہے تو بھی اس معرکہ میں کامیابی کی کوئی قیمت ہے نہ اس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا
 کوئی تعلق ہے۔

کبھی کبھی اس کے شخصی اور معاشرتی نتائج تباہ کن ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے شادی اسلام کے طریقوں میں سے ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ”کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
 ازواجِ مطہرات کے گھرائے اور آپ کی عبادت کے بارے میں دریافت کیا۔

جب انہیں بتایا گیا تو ایسا لگا کہ جیسے وہ اسے کم سمجھ رہے ہوں اور کہنے لگے ہمارا
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا مقابلہ آپ کے تو اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے
 ہیں۔

ایک کہنے لگا: میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھتا ہوں۔

دوسرا کہنے لگا: میں ہمیشہ روزے سے رہتا ہوں۔

تیسرا کہنے لگا، میں ہمیشہ عورتوں سے دُور رہتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: تمہیں لوگ ایسا ایسا کہہ رہے تھے؟ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تقویٰ رکھنے والا ہوں لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ تو جو میری سنت سے انحراف اختیار کرے وہ مجھ سے تعلق رکھنے والا نہیں۔ (بخاری)

حضرت انسؓ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے جسے نیک بیوی دی اسے اس کے نصف دین میں بد و پہنچا دی اب باقی نصف کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔“ (طبرانی)

○
اسلام جس طرح رہبانیت کو مسترد کرتا ہے اسی طرح جنسی ضرورت کی تکمیل کے لیے انسان کو بے لگام چھوڑنے اور حدود سے تجاوز کرنے کو بھی مسترد کرتا ہے۔
یہ حقیقت ہے کہ زنا بہت بڑی برائی ہے اور اسلام اس ذلت تک پہنچانے والے تمام راستوں کو بند کرتا ہے۔

اور جو اس کا ارتکاب کرتے ہیں انھیں قاتلوں اور رہزنوں کی طرح مجرم قرار دیتا ہے جب تک مغرب تہذیب کے علم بردار جنسی ضرورت کے تعلق سے اپنے بے لگام خیالات پر باقی رہتے ہیں ان کے اور ہمارے درمیان اختلاف برقرار رہے گا۔

اسلام جسم کی ضرورتوں کو تسلیم کرتا ہے اور ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے جائز حدود میں مواقع فراہم کرتا ہے لیکن اسراف و حماقت کی چھوٹ نہیں دیتا۔

لوگوں کے جموں کو جتنی ترارت غریبی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کچھ زیادہ یا کم کھانا کھاتے ہیں لیکن پیٹ کو جس کھانے کی بھی خواہش ہو اسے ہیا کیا جائے اسے دین تسلیم کرتا ہے نہ شرافت۔

جو لوگ کھانے کی میزوں پر ٹوٹ پڑیں اور معدے کی طاقت سے زیادہ اس میں کھانا ٹھونس لیں۔ چاہے وہ ان کی اپنی کمائی ہی کا ہو۔۔۔ وہ فضول خرچی کے مرتکب ہوں گے اور دنیا و آخرت میں اس کے انجام سے ڈرنا چاہیے۔

اور اگر یہ کمائی لوٹ مار اور حرام کی ہو تب کیا انجام ہوگا؟

یہی حال جنسی ضرورت کا بھی ہے حلال طریقہ سے اسے پورا کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس ضرورت کو اشتعال و لا دلا کر بڑھانا کہاں کی عقل مندی ہوگی؟ آخر عورت کو بنا سنوار کر ہر جگہ موجود رکھنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے؟

اس طرح کی لذت پرستی کی بیاس کبھی سمجھ سکتی ہے؟

اس طرح تو حیوانی جذبات کی آگ کو بھڑکانا ہوا اور دلوں میں ڈر پیدا کرنے والا ایمان بھی منقود ہو تو ان جذبات کو آخر کس طرح قابو میں رکھا جاسکتا ہے؟ اسی لیے عورت کو اپنی زیب و زینت ظاہر کرنے سے روکا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو نکاح میں جھکائے اور شرمگاہوں کی حفاظت کر لیا حکم دینے کے بعد فرماتا:

اور اے نبی! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی	وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ
نظریں سچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی	أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ
حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں	وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ
بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے	مِنْهَا وَلِيُضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى
سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں	جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ
اور اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں	إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ
کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ،	بُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاؤِ
اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں	بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي
کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی	إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَاتِهِنَّ أَوْ
عورتیں، اپنے لونڈی غلام، وہ زیر دست	نِسَاءِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ
مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور	أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ

الرِّجَالِ أَوْ الْتِظْفَالِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا
عَلَى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ - (النور - ۳۱)

وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی
واقف نہ ہوئے ہوں۔

اور

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ
مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ وَتُؤَدُّوا إِلَى
اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهُ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ
تَتْلِحُونَ - (النور - ۳۱)

اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا
کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی
ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ اے مومنو!
تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو۔ تو قے ہے
کہ فلاح پاؤ گے۔

یعنی دوپٹہ اس طرح اوڑھیں کہ سینہ کا اوپری حصہ بھی ڈھک جائے۔
پھر چلنے میں اعتدال اختیار کریں تاکہ نچلے حصے کی زینت نہ ظاہر ہو سکے۔
آج جو کچھ تقریبات میں اور سڑکوں اور تفریح گاہوں میں دکھائی دیتا ہے اسلام
اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔



آج دنیا شدید جنسی گناہوں میں ڈوب رہی ہے اور اس کا اولین سبب یہی ہے
کہ عورت اور مرد کے درمیان تعلق کے سلسلے میں حکم الہی کو نظر انداز کیا جا رہا ہے ہم صاف
کہنا چاہتے ہیں کہ:

اسلام نوجوان مردوں اور عورتوں کے اس اختلاط کو ناپسند کرتا ہے جو "جائز ریاضت"
کے نام پر رقص گاہوں میں ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"تم میں سے کسی کے سر میں لوہے کی کنگھی پھیری جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ

کسی عورت کو چھوتے جو اس کے لیے حلال نہ ہو" (طبرانی)

اسلام مردوں اور عورتوں کی مشکوک خلوتوں کو بھی ناپسند کرتا ہے چاہے اسے جو
بھی نام دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

”کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں ہوتا ہے تو ان کا تیسرا ساتھی شیطان ہوتا ہے“ (منذری)

محبت کے نام پر، پسندیدگی کے نام پر یا کسی اور عنوان سے یہ ہرگز جائز نہیں کہ نوجوان مرد اور عورت کے درمیان عشقیہ باتوں یا بوسوں کا تبادلہ ہو کیونکہ یہ جرم کی تمہید بن جاتا ہے۔ اسلام اس طرح کی تمہیدوں کو بھی گناہ قرار دیتا ہے۔

جو نگاہ عورتوں کا تجسس کرے وہ بھی زنا کی مرتکب ہے، جو ہاتھ ان کے جسموں کو ٹھویں وہ بھی زنا کے مرتکب ہیں اور جو بھی اس طرح کی کوئی چیز کرے گا گناہ گار ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”آنکھوں کا زنا (جنسی عورتوں پر) نگاہ ڈالنا ہے۔ کانوں کا زنا (ان کی باتیں) سننا ہے، زبان کا زنا (ان سے) بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا (انھیں) پکڑنا ہے، پیروں کا زنا (گناہ کی طرف) چلنا ہے۔ دل میں خواہش و تمنا پیدا ہوتی ہے اور اس کو پورا کرنا یا نہ کرنا شرم گناہ کا کام ہے“ (بخاری)

مسلم کی ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ”منہ کا زنا بوسہ ہے“ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہر گناہ کا رازہ تصرف کی مناسب سزا رکھی ہے۔ انسان بُرائی کی نیت سے جو بھی حرکت کرے گا اس کی سزا ضرور ملے گی۔ اس سختی کا مقصد جرائم کے دروازے بند کرنا ہے۔

طبعی رجحان کے نام پر فحش کی ہلاکت میں پڑنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ جب میں یہ سطر میں لکھ رہا ہوں تو میرے سامنے اخبار کی ایک خبر ہے کہ ”برطانیہ کے ترقی پسند سماج میں پہلی مرتبہ فلاح و بہبود کے لیے ایک ایسا بڑا پروگرام منعقد کیا جا رہا ہے جس میں پیرس کی ایک مشہور رقاصہ حاضرین کے سامنے رفتہ رفتہ اپنے کپڑے اتار کر مادر زاد ننکا جسم دکھائے گی اور پھر اس کے اتارے ہوئے ایک ایک کپڑے کو علاحدہ علاحدہ نیلام کیا جائے گا۔ اس پروگرام میں برطانیہ کی ممتاز شخصیات شریک ہوں گی۔

پر وگرم یورپ کے پناہ گزینوں کی مدد کے لیے منعقد کیا جا رہا ہے۔“

یہ اس قوم کے شعور کا عالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا ہے اور اس کی

حدود کو پامال کر چکی ہے اور مشرق و مغرب میں یہی کلچر پھیلانے پر کمر بستہ ہے۔

لَوْلَا يَنْهَاهُمْ رَبِّيَانِيُونَ وَالْأَحْبَابُ كِيوں ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر

عَنْ قَوْلِهِمْ إِلَيْكُمْ وَاللَّحْمَاءُ لِسْتِمْ زبَان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے

لَيْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ۔ یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ

المائدة - ۶۳ تیار کر رہے ہیں۔

اخلاق پسند مشرق کو اس اجتماعی زوال سے دور رہنا چاہیے۔

خاندان

خاندان، مرد و عورت، دونوں جنوں کا فطری ٹھکانہ اور دونوں کے پاکیزہ تعلقات کا واحد ذریعہ ہے۔

انسان تنہا اوصو رہے دوسری صنف سے مل کر ہی پورا ہوتا ہے۔
اگر ہم صحیح نقطہ نظر سے دیکھیں تو جنسی خواہش کی حیثیت خاندان کی تشکیل میں
مناوی ہے۔

اس کی اصل اور شریفانہ بنیاد محبت، النیت اور باہمی الفت کی بنیاد پر قائم ہونے
والی صحبت و رفاقت ہے۔

اسی بنیاد کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے؛
هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا۔
کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس
کے پاس آرام حاصل کرے۔ (الاعراف - ۱۸۹)

اس سکون کا مطلب یہ ہے کہ مرد مستقل طور پر یہ محسوس کرے کہ اس کے ساتھ کوئی
اور بھی جسے اسے وہ راحت حاصل کر سکتا ہے، اس کی رفاقت میں اپنا رنج و غم بھولتا
ہے اور تنگی کے وقت اس سے دل کو خوشی و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

مناوی کا یہ مطلب سمجھنا کہ وہ محض جنسی بندھن ہے ذہن و شعور کی گراوٹ کی
دلیل ہے۔ معاملہ اس سے کہیں زیادہ اہم اور بڑا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ
 أَرْوَاجًا لَتَكُنُوا إِلَيْهَا رَاجِعِينَ
 بَيْنَكُمْ مَوَدَّةٌ وَرَحْمَةٌ۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے
 لیے تمہاری ہی قسم سے جوڑے بنا دیے کہ چین
 سے رہوان کے پاس اور تمہارے درمیان پیار
 اور مہربانی رکھی۔ (الرؤم - ۲۱)

اس روحانی حقیقت کی بنیاد پر گھرانوں کی تشکیل کافی تربیت یا زیادہ صحیح تعبیر کے
 مطابق اخلاق و دینداری چاہتی ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات بہت گہرے اور وسیع نوعیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے اسلام
 ان کے تحفظ اور نظاہری و باطنی اعتبار سے ان کی اصل خصوصیت کی حفاظت پر زور
 دیتا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٍ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٍ
 لِهِنَّ۔ (البقرة - ۱۸۷) ہو۔

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے دن بدترین شخص وہ مرد ہوگا جو اپنی عورت
 سے راز کی باتیں کرے اور وہ عورت اس سے راز کی باتیں کرے پھر وہ مرد وہ باتیں
 ادھر ادھر پھیلا دے“ (ابوداؤد)

بیوی کے ساتھ خوش اخلاقی ایمان کی علامتوں میں سے ہے۔
 ”تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر
 ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں“ (حاکم)
 ”مسلمان مرد جو کھیل بھی کھیلتا ہے وہ بیکار ہے سوائے تیر اندازی کے اور
 اپنے گھوڑے کو سدھارنے کے اور اپنی بیوی سے کھیل کے۔ یہ درست چیزیں ہیں“
 (ترمذی)

دیکھئے میاں بیوی کے درمیان خاص انسانی تعلق کو کس طرح حق ٹھہرایا گیا۔
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مزید فرماتے ہیں:

”دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔“ (مسلم)
 اس طرح کی نصیحتوں سے آپ نے مرد کو سمجھایا کہ زندگی میں ساتھی بنانے اور
 اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مدد حاصل کرنے کے لیے سب سے بہتر ایسی بیوی ہوتی
 ہے جو بہترین اخلاق والی ہے یا جس کی صفت ایک دوسری حدیث میں اس طرح
 بیان کی گئی ہے:

”جس پر شوہر (اگر نگاہ ڈالے تو وہ اسے خوش کرے، اگر اسے کوئی حکم دے تو
 وہ اس کی اطاعت کرے اور خود اپنے تعلق سے اور اس کے مال کے بارے میں کوئی ایسا
 تصرف نہ کرے جو شوہر کو ناپسند ہو۔“ (ترمذی)

بلاشبہ اس طرح کی بیوی نیک بخت گھرانے کا بنیادی ستون ہوتی ہے۔
 خاندان کے درمیان تعلقات مرنے کے بعد ختم نہیں ہو جاتے۔ اگر اس دنیا میں
 موت ان کا شیرازہ منتشر کرے تب بھی وہ آخرت میں پھر جمع ہو جاتے ہیں۔
 جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ
 صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ
 وَذُرِّيَّاتِهِمْ۔ (الرعد- ۳۳)
 اسی طرح:

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ان
 کی راہ پر چلی ایمان سے ہم نے ان کی اولاد
 کو ان تک پہنچا دیا اور ہم نے ان سے ان
 کا کیا ذرا بھی کٹھایا نہیں۔ (الطور- ۲۱)

اور جس طرح ایمان رکھنے والا خاندان جنت کی نعمتوں میں اکٹھا ہوگا اسی طرح
 انکار کرنے والے خاندان عذاب میں یکجا ہوں گے۔

أَحْسَرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجِهِمْ
 وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ
 جمع کرو گئے گناہ گاروں کو اور ان کے جوڑوں کو
 اور جو کچھ اللہ کے سوا وہ پوجتے تھے پھر ان کو

فَاهِدُوهُمْ إِلَى صِرَاطِ الْجَحِيمِ دوزخ کی راہ پر چلاؤ۔

(الصافات - ۲۲ - ۲۳)

کتنی عجیب بات ہے کہ یہ انسانی تعلقات برقرار رہیں گے۔
لیکن ازدواجی زندگی کی نوعیت کو سمجھا جائے تو تعجب کی صورت باقی نہیں رہ سکتی۔
اس کی بنیاد دوستی و رفاقت کے جذبہ سے بھی بلند تر ان جذبات پر قائم ہوتی ہے
جو میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے رکھتے ہیں پھر ان کے زیر سایہ آنے والی نسلیں
پر وہ ان چڑھتی ہیں۔

اولاد کی پرورش اور تربیت کے لیے خاندان سے زیادہ صاف ستھرا اور مناسب
کوئی اور ماحول نہیں مل سکتا۔

مادرانہ محبت اور پدرانہ شفقت — جو سب سے مضبوط اور گہرے انسانی
احساسات ہوتے ہیں — ان کی کفالت و نگہداشت کرتے ہیں اور انتہائی صبر کے
ساتھ ان کو پرہیزگار چڑھاتے ہیں۔

اسی لیے خاندان کا تحفظ اہم ترین ذمے داریوں میں سے ہے اور اس کا راستہ
ہموار کرنا ثواب کے بہترین کاموں میں سے ہے۔



چونکہ گھر کے اخراجات، میاں بیوی کو پیش آنے والے مسائل میں، سب سے زیادہ
اہمیت رکھتے ہیں اور اس بوجھ کو اٹھانے کی ذمہ داری مرد پر ہونے کی وجہ سے اسے
زیادہ دقت پیش آتی ہے اس لیے بسا اوقات اس میں اختلاف رائے پیدا ہو جاتا
ہے کہ کس چیز پر خرچ کیا جائے اور کس خرچ کو روکا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرما دیا ہے کہ گھر کے ضروری اخراجات
ضائع ہونے والی چیز نہیں بلکہ ان کا اجر و ثواب باقی رہتا ہے۔

”جو دینار تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا، جو دینار کسی غلام کو آزاد کرانے میں
خرچ کیا، جو دینار کسی مسکین کو صدقہ میں دیا اور جو دینار اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔“

ان میں سے سب سے زیادہ اجر و ثواب والا دینار وہ ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔ (مسلم)

اس ہدایت پر خاص توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ بعض لوگ اپنے آل اولاد کے مفادات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جبکہ دوسری جگہوں پر خرچ کرتے ہیں۔ اسلام گھر کی کفالت اور اس کی ضروریات کی فراہمی کو ایک اہم ذمے داری قرار دیتا ہے۔

البتہ گھر کی ضروریات کے بارے میں کوئی حتمی حد و تفصیل بیان نہیں کی جاسکتی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں اس بات پر تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو چکی ہے کہ اہبات المؤمنین زیادہ خرچ طلب کر رہی تھیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس میں دشواری تھی۔

اسلام اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ خرچ کے معاملہ کو پورے خاندان کو مشکلات میں مبتلا کرنے اور اس کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنے کا سبب بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ وَلَا يُكَلِّمِ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَّا آتَاهَا سَيِّئًا يَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا۔
 (الطلاق - ۷)

کشاوگی والا، اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی روزی پنی تلی ملتی ہے تو جیسا کہ اسے اللہ نے دیا ہے (اس کے مطابق) خرچ کرے۔ اللہ کسی پر اسی قدر بوجھ ڈالتا ہے جو اس کو دیا ہے جلد ہی اللہ سختی کے پیچھے آسانی کر دے گا۔

اور یہ حکم الہی ان بہت سے احکام کے بعد آیا ہے جن میں حسن اخلاق اور تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس کا پس منظر گھروں میں پیدا ہونے والے اختلافات ہیں جن سے خاندان کو جوڑنے والے روابط ہی متاثر ہو جاتے ہیں۔ قِيَامُ سِكْوٰهِنَّ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَوَانٍ كُوْدَسْتُوْر كُءِ مَطَابِقٍ رِكْهُوِيَا دَسْتُوْر كُءِ

مطابق تھوڑے دو اور اپنے میں سے دو محبت گزارا
کرو اور اللہ کے واسطے کو ایسی ہی سیدھی ادا کرو۔

یہ بات جو ہے اس سے جو کوئی اللہ پر اور یوم
آخرت پر ایمان رکھتا ہوگا، سمجھ جائے گا اور
جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کا گزارہ
کر دیتا ہے اور جہاں سے اسے خیال بھی
نہ ہو وہاں اسے اسے روزی دیتا ہے۔ اور
جو کوئی اللہ پر بھروسہ رکھے تو وہ اس کو
کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر لیتا ہے۔ اللہ
نے ہر چیز کا اندازہ رکھا ہے۔

اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا رہے وہ اس کے
کام میں آسانی کر دیتا ہے۔

اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا رہے اللہ اس پر
سے اس کی برائیاں اتار دیتا ہے اور اس کو
بڑا ثواب دیتا ہے۔

فَارْتَوْهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا
ذَوِي عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ
لِلَّهِ - (الطلاق - ۲)

ذَالِكُمْ يَوْمَظَبِيهِ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَتَّقِ
اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ
مِنْ حَيْثُ شَاءَ يَخْتِيبُ - وَمَنْ
يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ
إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ
لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا -

(الطلاق - ۲-۳)

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ
أَمْرِهِ يُسْرًا -

(الطلاق - ۴)

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ
وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا -

(الطلاق - ۵)

شادی آزادانہ بندھن ہے

خاندان کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے اسلام نے یہ اصول بتا دیا ہے۔ شادی دو بالکل بااختیار فریقوں کے درمیان ایک آزادانہ بندھن ہے۔ نہ مرد کو اس پر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ جسے پسند نہیں کرتا اس سے شادی کرے اور نہ عورت کو اس پر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ جس سے نفرت کرتی ہے اسے قبول کرے۔ کبھی ایسا ہو جائے کہ لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دی گئی تو اسلام کی نگاہ میں اس جبر کی کوئی قیمت نہیں۔

حضرت خنساء بنت حزام سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کی شادی ایسے شخص سے کر دی جو انھیں پسند نہیں تھا۔ تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس معاملہ لے گئیں۔ آپ نے اس نکاح کو مسترد کر دیا۔ (بخاری)

ایک روایت میں ہے کہ ایک لڑکی رسول اللہ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ اس کے والد نے اس کی شادی ایسی جگہ کر دی ہے جو اسے پسند نہیں آپ نے اسے اختیار دیا کہ وہ چاہے تو مان لے ورنہ مسترد کر دے۔ (احمد)

ایک روایت میں ہے "اس نے عرض کیا کہ میرے والد نے لالچ کی وجہ سے میری شادی اپنے بھتیجے سے کر دی ہے اور مجھے وہ پسند نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اپنے والد کی بات مان لو اور اگر نہ چاہو تو منسوخ کر دو۔"

اس نے عرض کیا کہ: میں نے اپنے والد کی بات مان لی لیکن میں نے ایسا اس لیے کیا کہ عورتیں یہ جان لیں کہ باپوں کو اس میں زبردستی کرنے کا حق نہیں ہے۔ (بخاری)

ہاں باپ اور ولی کو اس کا عمومی حق ہے کہ اگر لڑکی اپنے بارے میں کوئی غلط تصدیق کر بیٹھے مثلاً کسی دھوکے باز یا ناچنے گانے والے جیسے گھٹیا شخص سے شادی

کرنا منظور کرے تو وہ اعتراض کر سکیں۔

رٹکیاں اکثر اپنے بھولے پن میں دھوکے بازوں کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔
اگر کفو کے ساتھ عقد نہیں ہوتا تو ولی کے اعتراض کے بعد قاضی اسے منسوخ

کرنے لگا۔

اسلام نے عورتوں کو اجازت دی ہے کہ وہ معقول حد کے اندر تصرف کریں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي
الْأَنْفُسِ مِنَّ بِالْمَعْرُوفِ
تم پر اس بات میں کچھ گناہ نہیں کہ وہ اپنے حق
میں قاعدہ کے موافق (نکاح) کریں۔

(البقرہ - ۲۳۴)

اور اسلام میں کفارت دین و اخلاق میں ہے جب نسب اور دولت میں نہیں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

”اگر تمہارے پاس کوئی ایسا شخص پیغام لائے جس کی دینداری اور امانتداری سے تم
مطمئن ہو تو اس سے شادی کر دو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو روئے زمین پر فتنہ اور زبردست
بگاڑ پیدا ہوگا (یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی) (ترمذی)

مرد گھر کا ذمے دار ہے

شریعتِ الہی میں مرد گھر کا ذمے دار اور خاندان کو چلانے والا ہے۔ اور اس میں شرف و مرتبہ سے کہیں زیادہ ذمے داری کا پہلو ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گھر ایک مستحکم نظام کے مطابق چلے۔ متضاد خواہشات اور رجحانات کے ٹکراؤ کا شکار نہ ہو جائے۔

کوئی کینی بنی ذمے دار سربراہ کے ہو، اس کا تصور بھی فضیول ہوگا۔ عورت کے سرگھر کی ذمے داری ڈالنا ایک کمزور کندھے پر بھاری بوجھ ڈالنا ہوگا۔ گھر کو چلانے اور خاندان کے سربراہی کے زیادہ لائق مرد ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کمانے، خرچ کرنے اور تحمل و پامردی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی زیادہ صلاحیت دی ہے۔

مرد عورتوں پر توام (ذمے دار) ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

الرِّجَالُ كَوَامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا
فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ
وَبِمَا تَقَوُّوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ

(النساء - ۳۴)

کسی کسی گھرانے میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ باصلاحیت ہوتی ہے ایسی صورت میں سربراہی مرد سے چھین جاتی ہے یا وہ خود اس سے دستبردار ہو جاتا ہے اور سربراہی عورت کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔

لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے، اسے عام قاعدہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ فطری بات یہی ہے کہ زندگی اپنی فطری رفتار سے چلتی رہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ
ان پر حق ہے دستور کے موافق۔ اور مردوں کو
عورتوں پر فضیلت ہے۔ (البقرہ - ۲۲۸)

اس رہنما اصول کے ساتھ اسلام نے ایسی بہت سی تعلیمات دی ہیں جن میں مرد پر عورت کے حقوق اور عورت پر مرد کے حقوق واضح کیے گئے ہیں، اور جن سے خاندان میں نیکی و تقویٰ اور محبت و تعاون کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور ازدواجی زندگی کے استحکام، اولاد کی اچھی پرورش اور نفسیاتی سکون و خوش بختی کی ضمانت ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مردوں کو سکھایا جائے کہ عورتوں کے کیا کیا حقوق ہیں اور ان سے وفاداری اور عزت کا سلوک کس طرح کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح عورتوں کو سکھایا جائے کہ مردوں کے حقوق کیا کیا ہیں اور کس طرح ان کا احترام و عزت کی جانی چاہیے۔ حضرت میمون کردی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

”جس مرد نے بھی کسی عورت سے کم یا زیادہ جتنی بھی مہر پر شادی کی اور اس کے دل میں یہ تھا کہ وہ اس کا حق ادا نہیں کرے گا تو اسے دھوکا دیا اور موت تک ادا بھی نہیں کیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے بحیثیت زنا کار پیش ہوگا۔ اور جس شخص نے بھی قرض لیا اور اسے ادا کرنے کی نیت نہیں تھی تو اس نے اسے دھوکا دیا اور موت تک ادا نہیں کیا وہ اللہ کے سامنے بحیثیت چور پیش ہوگا۔“

(طبرانی)

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

”میں سے ہر ایک ذمے دار ہے اور جس کا ذمہ دار ہے اس کے سلسلے میں

جوابدہ ہے، امام ذمّے دار ہے اور اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے،
 مرد اپنے گھروالوں کا ذمّہ دار ہے اور ان کے بارے میں
 جواب دہ ہے، عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمّہ دار ہے اور اس کے بارے میں جواب دہ
 ہے، خادم اپنے آقا کے مال کا ذمّہ دار ہے اور اس کے بارے میں جواب دہ ہے۔
 (الغرض) تم میں سے ہر ایک ذمّے دار ہے اور اپنی ذمّے داری کے سلسلے میں جوابدہ ہے۔ (بخاری)
 حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”مومنین میں سب سے کامل ایمان اس کا ہے جو سب سے بہتر اخلاق والا

اور اپنے گھروالوں کے سلسلے میں سب سے نرم ہو“ (ترمذی)

حضرت معاویہ بن حیرہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم
 میں سے کسی کی بیوی کا اس پر کیا حق ہوتا ہے؟

آپ نے فرمایا: کھانے کی ضرورت ہو تو اسے کھانا کھلاؤ، لباس کی ضرورت ہو
 تو اسے لباس پہنا کرو، چہرے پر نہ مارو نہ بگاڑو، اور گھر کے اندر کے علاوہ اس سے
 کنارہ کشی نہ کرو۔ (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”عورت اگر پانچوں نمازیں پڑھ لے، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کر لے اور اپنے شوہر
 کی اطاعت کر لے تو جنت کے جس دروازے سے چاہے اس میں داخل ہو جائے“
 (ابن حبان)

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آپ کے پاس عورتوں کی نمائندہ
 بن کر آئی ہوں (عرض یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے مردوں پر تو یہ جہاد فرض کیا ہے۔ اگر وہ کامیاب
 ہوتے ہیں تو انھیں اجر ملتا ہے اور اگر قتل ہو جاتے ہیں تو اپنے رب کے پاس زندہ
 رہتے ہیں اور رزق پاتے ہیں۔ اور تم عورتیں (ان کے گھروں کی) دیکھ بھال کرتی ہیں
 تو ہمیں اس میں سے کیا اجر ملے گا؟

آپ نے فرمایا: عورتوں میں سے تمہیں جو بھی مل جائے اسے بتا دو کہ شوہر کی

اطاعت اور اس کے حق کا اعتراف اس (جہاد) کے برابر ہے اور تم میں سے کم ہی ایسا کرتی ہیں“ (بزار)

حضرت زید بن ارقم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عورت اس وقت تک اللہ تعالیٰ کا حق ادا نہیں کرتی جب تک اپنے شوہر کا حق ادا نہ کرے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اس سے خواہش ظاہر کرے اور وہ کھانا پکانے میں مشغول ہو تو بھی انکار نہ کرے۔ (طبرانی)

کیا گھر میں ہمیشہ خوشی کا ماحول ہی رہتا ہے؟ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کبھی کبھی ماحول کشیدہ بھی ہو جاتا ہے۔

مکمل راحت و سکون ایک خیالی چیز سے زیادہ نہیں۔

انسان تنہا رہے یا کسی دوسرے کے ساتھ ہمیشہ خوشی کے موڈ میں نہیں رہ پاتا۔

یہ سمجھداری کی بات ہے کہ دل کو بعض تلخیوں اور ناگوار چیزوں کو برداشت کرنے

پر آمادہ کیا جائے اور برے نتائج تک نہ پہنچنے دیا جائے۔

چونکہ اسلام کی نگاہ میں مرد گھر کا ذمے دار ہوتا ہے اس لیے اسے صبر و برداشت

سے کام لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں انھیں سیدھا

کرنے کے چکر میں کہیں توڑ ہی نہ بیٹھو۔ (یعنی طلاق تک نوبت نہ پہنچ جائے) اس لیے

وہ جیسی ہیں اسی طرح ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔



یہ نفسیاتی طور پر ذلت آمیز بات ہے کہ شوہر یا بیوی جیسی نعمت کی بے قدری کی

جائے لوگ۔۔۔ مرد اور عورت دونوں۔۔۔ اکثر احسان بھول جاتے ہیں گویا کسی

نعمت کی قدر دانی اور نعمت والے کا احترام کوئی بہت بڑا بوجھ ہے۔

بے قدری سے دوسرے انسان کا دل بچھ جاتا ہے۔

جو عورت اپنے شوہر کی بے قدری اور احسان ناشناسی پر اپنے طرز عمل کی بنیاد

رکھے وہ یقیناً اپنے لیے تباہی کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے:
 ”اللہ تعالیٰ اس عورت کی طرف نگاہ نہیں اٹھائے گا جو اپنے شوہر کی شکر گزار
 نہ ہو جبکہ اس سے بے نیاز بھی نہیں ہو سکتی“ (حاکم)

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے:

”مجھے جہنم دکھائی گئی تو اس میں اکثریت انکاری عورتوں کی تھی۔

عرض کیا گیا: کیا وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتی تھیں؟

فرمایا: نہیں، احسان اور صاحب خاندان کی منکر تھیں۔ اگر تم ان میں سے کسی

کے ساتھ ایک زمانے تک حسن سلوک کرو پھر وہ کبھی کوئی ناگوار چیز دیکھ لے تو کہہ دے
 گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی“ (بخاری)

طلاق سے متعلق غلطیاں

اشتعال کے زیر اثر کسی اقدام کے نتیجے میں خاندان کی تباہی سے معاشرے کو جو انتہائی نقصان پہنچتا ہے اس کے مضر اثرات اور ان تعلیمات کے باوجود جو اسلام نے خاندان کے استحکام کی اہمیت کے سلسلے میں واضح طور پر دی ہیں، مسلمان کچھ دنوں سے اس اہم معاملے میں اپنے دین کی رہنمائی کو دانستہ یا نادانستہ طور پر، نظر انداز کر کے اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم کر رہے ہیں۔

انہوں نے جان بوجھ کر بعض احکام کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور بعض احکام کی صورت بگاڑنے کے لیے ذہنی مریضوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے جس کے نتیجے میں المناک فقہی اور علی انتشار پیدا ہو رہا ہے۔

مثلاً میاں بیوی کے اپنے باہمی مسائل کے حل کرنے میں ناکام ہو جانے کی صورت میں ثالثی کا مسئلہ لیجے لگتا ہے مسلمان اس حکم کو یکسر نظر انداز کر دینے پر متفق سے ہو گئے ہیں کسی ڈوبنے والے خاندان کو بچانے کی کوشش خال خال ہی نظر آتی ہے جبکہ الہی ہدایت بالکل واضح ہے۔

اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے کھڑا کرو اگر وہ دونوں صلح کرانا چاہیں گے

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَأَبْعَثُوا
حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ
أَهْلِهَا إِنْ يَرِيدَا إِصْلَاحًا
بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ كَافٍ

عَلِيمًا خَيْرًا - تو اللہ ان دونوں میں موافقت کر دے گا۔

(النساء - ۳۵) بے شک اللہ سب کچھ جانتے والا خبردار ہے۔

آخر اس سے انحراف کا راز کیا ہے، کیا صلح صفائی کرانے سے دلچسپی ہی ختم ہوگئی ہے؟ یا باپ کی زندگی ہی میں بچوں کو یتیم بنا دینے میں دلچسپی پیدا ہوگئی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی ہدایات سے آنکھیں بند کر لینے کا یہ عجیب معاملہ ہے۔

اسلام میں طلاق ازدواجی تعلق کو روکنے سے شروع ہوتی ہے اسے منقطع کر دینے سے نہیں۔ جیسے کوئی ملازم اپنے کام کے ساتھ تعلق باقی رکھنے کے باوجود کسی معذوری کی وجہ سے عارضی طور پر کام پر نہ جائے۔

اسی لیے یہ لازم کیا گیا ہے کہ طلاق ہونے کے بعد بھی عورت شوہر کے گھر میں رہے ابھی وہ اس کا گھر برقرار ہے۔ مرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اسے گھر سے نکال دے۔ کیا مسلمان عملاً ایسا کرتے ہیں؟ کیا طلاق کا لفظ سننے کے بعد عورت گھر میں رہتی ہے؟

عام طور پر اس ہدایت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ فکروہ لفظ سنتے ہی عورت گھر چھوڑ دیتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو کوئی حل نکلنے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ کیا اس طرح کا بچکانہ جذبہ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت پر عمل ہے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ
فَطَلِقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا
الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تَخْرِجُوهُنَّ
مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا
أَنْ يَأْتِيَنَّ بِمَآحِشَةٍ مُّبِينَةٍ
وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ -

اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت پر طلاق دو اور عدت کو گنتے رہو اور اللہ سے جو تمہارا رب ہے ڈرو ان کو ان کے گھروں سے مت نکالو اور وہ بھی نہ نکلیں سوائے اس کے کہ جو صریح بے حیائی کریں یہ اللہ کی بانڈھی ہوئی حدیں ہیں۔

(الطلاق - ۱)

اسلام نے مطلقہ عورت کو شہرہ کرنے کا حکم دیا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت

تک انتظار کیا جائے جب اندھی تم جائے، ہنسی کی آواز جاگ جائے، دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر نظر ثانی کریں، باہمی کی یادوں اور مستقبل کے نتائج پر غور کریں اور اگر بچے ہوں تو ان کے مستقبل پر نگاہ ڈالیں۔

طلاق کے بعد ہی گھر چھوڑ دینا مفاہمت کا موقع ضائع کر دینا اور حماقت پر عقل و دانش کو غالب آنے سے روک دینا ہے۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ
ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ
يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا
اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے بڑھے تو اس
نے اپنا بڑا کیا۔ اس کو خیر نہیں شاید اللہ
اس طلاق کے بعد نئی صورت پیدا کر دے۔

(الطلاق - ۱)

لیکن اس کے باوجود مسلمان اس بارے میں اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ طلاق کوئی ایسا لفظ نہیں جسے چاہیں بول دیں اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک طریقہ مقرر فرمایا ہے۔

دو اصراف اسی سے فائدہ نہیں پہنچا سکتی کہ اس میں فائدہ پہنچانے والی چیزیں شامل ہیں۔ اس کو اس طرح استعمال کرنا بھی ضروری ہے جس طرح معالج بتائے۔ جو معالج کے بتائے ہوئے طریقے کے بجائے خود اپنی مرضی سے کوئی دوا استعمال کرے وہ نقصان پہنچنے کی صورت میں خود اپنے آپ ہی کو ذمے دار ٹھہرا سکتا ہے۔ طلاق کے لیے اسلام نے کچھ قائدے مقرر کیے ہیں۔

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں شوہر نے بیوی کو چھوانہ ہو اگر اس نے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو انتظار کرے کہ وہ حالت طہر میں پہنچ جائے۔ پھر اس طہر میں قریب نہ جائے پھر پورے شعور کی حالت میں وہ لفظ منہ سے نکالے یہ نہیں کہ جب چاہا طلاق دے ماری۔ اس طرح بیوی کو گھر میں رہنے میں بھی آسانی ہوگی۔

ان کو ان کی عدت پر طلاق دو اور عدت کو
طَلَّقُوهُنَّ عِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا

گنتے رہو۔

الْحِدَاةَ۔ (الطلاق۔ ۱)

یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی سنت ہے جسے عام مسلمان نظر انداز کر رہے ہیں بہت سے فقہاء مذکورہ صورت کے علاوہ اور کسی بھی طریقے سے دی گئی طلاق کو مسترد کرتے ہیں۔ مثلاً حالت حیض میں طلاق دینے کو نہیں مانتے، وہ حرام ہے اور واقع نہیں ہوگی۔

وَمَنْ لَّحَدَّثَ فِيْ اَمْرِ نَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ۔ (مسلم) جو ہمارے معاملے میں کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے وہ مسترد ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مسلمان صرف طلاق بدعت ہی سے واقف رہ گئے ہیں جبکہ عام فقہاء اسے تسلیم نہیں کرتے، اگر سارے فقہاء اسی پر اتفاق کر لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

طلاق بدعت کو مسترد کرنا اور اس کو پائے حقارت سے ٹھکرانا ہی ہمارے نزدیک حق اور مصاحت کے مطابق ہے۔

پھر طلاق بہت سی صورتوں میں بالکل ہی بے معنی انداز میں دی جانے لگی ہے۔ اسے قسم بنا لیا گیا بلکہ جاہل لوگ عام طور پر اسی کی قسم کھانے لگے (مثلاً میری بیوی کو طلاق ہے اگر یہ بات نہ مانی گئی، یا یہ بات بھوٹی نکلیے یا فلاں مطالبہ پورا نہ ہو اور غیرہ وغیرہ) جب کہ یہ سب بالکل لغو ہے۔ قسم تو صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی کھائی جاسکتی ہے۔ اسی طرح نشے میں مدہوش اور پاگل پن کی حالت کے شکار لوگوں کی طلاق کا کیا وزن ہو سکتا ہے۔ وہ جو بولتے ہیں وہ ان کی نیت نہیں ہوتی، نہ وہ سمجھتے ہیں کہ کیا بول رہے ہیں۔

شادی کا بندھن پورے ہوش و حواس اور ارادہ و اختیار سے قائم ہوتا ہے اسی طرح اسے ختم بھی ہونا چاہیے۔



کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں طلاق کو پابند کرنا چاہتا ہوں کہ وہ قاضی کے سامنے

ہی دی جائے۔؟

نہیں، ہرگز نہیں۔

طلاق دنیا شوہر کا حق ہے۔ دنیا بھر کی پولیس یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ مرد کو کسی ایسی عورت کے ساتھ رہنے پر مجبور کر سکے جس سے وہ نفرت کرتا ہے اور قطع تعلق کا فیصلہ کر چکا ہے۔

اور اس طرح کا قانون خود عورت کے لیے بھی باعزت نہیں ہوگا۔ مغرب میں یہ صورت ہے کہ مرد ہی طور پر شوہر باقی رہتا ہے اور دونوں تعلق کہیں اور قائم کر لیتے ہیں۔

طلاق کے غلط استعمال کا علاج یہ ہے کہ علمی و اخلاقی سطح بلند کی جائے۔ امت کو اس کے پہلے اجتماعی اصولوں کی طرف لوٹایا جائے جو انتہائی شریفانہ ہیں۔ تعددِ ازواج پر پابندی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔

قانون اس میں عقیدہ اور حسن اخلاق کے تقاضوں سے زیادہ موثر ثابت نہیں ہو سکتا۔ کچھ لوگ یقیناً اس حق کا غلط استعمال کرتے ہیں لیکن اس مرض نے خاندان کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا ہے جتنا مغرب سے آئی ہوئی جنسی و اخلاقی انارکی اور انتشار نے خاندان کی بنیادوں کو ڈھانے میں کردار ادا کیا ہے۔

ایسے لوگوں کے منہ سے تعددِ ازواج پر پابندی کی بات کیا اچھی لگے گی جنہوں نے اپنی عمریں سیکڑوں عورتوں کے ساتھ گزاری ہیں۔

کچھ ناگزیر باتیں

مرد کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ تنگدلی کے احصات کو آگے نہ بڑھنے دے اور اپنی بیوی کی جو باتیں اسے ناپسند ہوں انھیں میں ذہن کو نہ الجھائے رکھے بلکہ اس کے اچھے پہلوؤں پر توجہ دے۔ بیوی کی سیرت اور طرز سلوک میں اسے بہت سے خوشگوار پہلو بھی ضرور ملیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

”کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی بات ناگوار ہوگی تو کوئی خوشگوار بھی ہوگی۔“ (مسلم)

اگر مرد پر بدگمانی ہی غالب آجائے اور یہ سمجھنے لگے کہ وہ اس سے مکمل نفرت کرتا ہے تو اسے یہ جاننا چاہیے کہ بدگمانیاں اکثر غلط ثابت ہوتی ہیں اور کبھی کبھی مرد ہی بھلائی کی باتوں کو سمجھنے میں کوتاہی کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

رَعَا شَرُّهُنَّ بِالمَعْرُوفِ فَيَا ن
كِرِهَتْهُمُوهِنَّ نَفْسِي اَنْ تَكْرَهُوا
شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا
اور عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گزار کر و پھر
اگر وہ تمہیں نہ بھاویں تو شاید تم کو ایک خیر
پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت خوبی
رکھی ہو۔ (النساء۔ ۱۹)

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اچھے سلوک اور دلنشیں نصیحت سے سدھر جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں نرمی کے بجائے کبھی سختی ہی سدھار پاتی ہے۔

عورت کو سدھارنے کے سلسلے میں سختی آخری علاج ہے اور اسے اسی وقت اختیار کیا جاسکتا ہے جب نرمی بے اثر ہو جائے اور وہ بالکل ہی سرکشی پر بصد ہو لیکن سختی کی صورت میں بھی اسے چہرے پر مارنے یا اس کی شکل بگاڑ دینے تک جانے کی اجازت نہیں۔ ایک پرسکون و ہم آہنگ خاندان کے سایہ میں اچھی عادتیں پروان چڑھتی ہیں۔ شریفانہ روایات مستحکم ہوتی ہیں اور ایسے افراد تیار ہوتے ہیں جو بڑی سے بڑی ذمے داری اٹھا سکیں۔ اور ایسی عورتیں تیار ہوتی ہیں جو بہترین مثالی گھرانے تشکیل دے سکیں۔ اسلام اسی لیے خاندان کے حالات سے بہت دلچسپی لیتا ہے اور ایسی ہدایتوں کے ذریعہ خاندان کو پروان چڑھانے پر زور دیتا ہے جو ہر اعتبار سے بھلائی اور آسائش کے فروغ میں مدد دیں۔

قرآن و حدیث میں ایسی ہدایات بہت ہیں جن میں خاندان کے تمام افراد — والد، والدہ، قریب اور دور کے رشتہ داروں وغیرہ — کے درمیان تعلقات کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ خاندان کی سلامتی ہی پورے معاشرے کے سکون و اطمینان کا واحد راستہ ہے۔

جس معاشرے میں خاندان کے روابط کمزور پڑ جائیں اس کا بھلا نہیں ہو سکتا اس نعمت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ
اَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ
بَنِيْنَ وَحَفَدًا ۗ وَرَزَقَكُمْ مِنَ
السَّطٰوٰتِ اَفْئَابًا بٰطِلًا يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ
اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ۔ (النحل - ۷۲)

اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری قسم سے
عورتیں پیدا کیں اور تمہیں تمہاری عورتوں
سے بیٹے اور پوتے دیے اور تمہیں کھانے
کو ستھری چیزیں دیں سو کیا جھوٹی باتیں مانتے
ہیں اور اللہ کے فضل کو نہیں مانتے۔

میاں بیوی کے درمیان باہمی تعلقات اور والدین کی گود میں بچوں اور بچیوں کی پرورش صرف انہیں کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ قوم کے حال و مستقبل کی نمائندگی کرتی ہے۔

اسی لیے جب شیطان کسی خاندان کا شیرازہ منتشر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو وہ محض ایک گھر کو مسمار نہیں کرتا اور ایک محدود برائی پیدا نہیں کرتا بلکہ پوری قوم کے لیے ایک دور رس برائی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

کسی خاندان کی بربادی سے شیطان کی آنکھیں کس طرح ٹھنڈی ہوتی ہیں اس کا اندازہ آپ اس حدیث سے کر سکتے ہیں:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ابلیس پانی کے اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے پھر اپنے لشکر ادھر ادھر بھیجتا ہے ان میں سے ابلیس کے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ پیدا کرے۔“

ایک آتا ہے اور کہتا ہے: میں نے فلاں فلاں کام کیا۔

ابلیس کہتا ہے: تم نے کچھ نہیں کیا:

پھر ایک آکر کہتا ہے: میں نے فلاں شخص کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب

تک اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان ایسی پھوٹ نہیں ڈال دی جس سے وہ پھر تڑپا نہ ہو سکیں۔

ابلیس کہتا ہے: ہاں تم نے کارنامہ انجام دیا۔ اور اسے چٹا لیتا ہے: ”مسلم“

فرد اور قوم کے تعلقات

قوم ایک بڑا خاندان ہے جس سے آدمی انتساب رکھتا ہے، اس کے پیغام کی علمبرداری میں شریک ہوتا ہے، اس کے میدان میں سرگرمیاں دکھاتا ہے، اس کے جھنڈے تلے جدوجہد کرتا ہے اور اس کی فتح یابی سے شاد کام اور اس کی ہزیمت سے شکستہ دل ہوتا ہے۔

بڑے دل اور کردار کا آدمی اپنی قوم کے تعلق سے اس سے زیادہ دلچسپی و اہتمام رکھتا ہے جو اسے خود اپنی ذات کے تعلق سے ہوتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ بہترین معاملہ کرتا ہے اور ہر ایسی چیز کے لیے کوشاں رہتا ہے جس سے اس کا تعلق اہل قوم سے مضبوط و مستحکم ہو۔

امتِ اسلامیہ اپنے پہلے دور میں باہمی الفت و محبت کا مثالی نمونہ تھی حکمرانوں اور عام شہریوں کے مابین تعلقات محبت و عزت پر مبنی تھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”تمہارے بہترین ائمہ (حکمران) وہ ہیں جن سے تم بھی محبت کرتے ہو اور جو تم سے بھی محبت کرتے ہیں اور جن کے لیے تم بھی دعا کرتے ہو اور جو تمہارے لیے بھی دعا کرتے ہیں۔“ (منذری)

اور یہ بات سمجھی ہو سکتی ہے جب دلوں میں صفائی ہو، انصاف کا بول بالا ہو اور وہ عام پیغام کامیاب ہو جس کی علمبرداری میں حکمران اور عوام ایک دوسرے سے

تعاون کریں۔

اس بارہی محبت اور اس جامع پیغام کی عظمت کا اندازہ آپ ان احساسات سے کر سکتے ہیں جو دشمن سے مقابلے کے وقت مجاہدین کے دلوں میں ہوا کرتے تھے۔ حضرت نعمان بن مقرن ایران کے محاذ پر نمایاں کمانڈروں میں سے تھے جنگ کے دوران ان کے جذبات محاذ سے دور عام اہل ایمان کے جذبات سے کس طرح مربوط ہوتے تھے فرماتے ہیں کہ:

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متعدد غزوات میں حصہ لیا جب فجر طلوع ہوتی تھی تو آپ جنگ سے رک جاتے تھے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے۔ پھر سورج طلوع ہونے کے بعد جنگ فرماتے تھے یہاں تک کہ جب دوپہر ہو جاتی تو رک جاتے، سورج ڈھل جاتا تو پھر عصر تک جنگ فرماتے تھے پھر رک کر نماز عصر فرماتے پھر جنگ فرماتے۔ آپ فرماتے تھے کہ ان اوقات میں مدد اور نصرت کی ہوائیں چلتی ہیں اہل ایمان اپنی نمازوں میں اپنے لشکروں کے لیے دعا کرتے ہیں۔“ (ترمذی)

اسلام اہل ایمان کے درمیان یہی مضبوط اخوت پیدا کرتا ہے اور اس کے بنیادی عناصر یہ ہوتے ہیں:

خالصۃً اللہ کے لیے اخوت۔

جسے ایمان کے مختلف شعبوں سے غذا ملتی ہے۔

جسے دعوت کے مقاصد باہم مربوط و مضبوط کرتے ہیں۔

کشاہت و تنگی دونوں صورتوں میں اللہ کے لیے جدوجہد کے مراحل جس کی نشوونما کرتے ہیں۔

یہی اخوت اسلام کی روح ہے اس کے نظام کالب لباب اور اس کی اجتماعت و حکومت کی بنیاد ہوتی ہے۔

اور جس بنیاد پر اسلامی معاشرے کی عمارت کھڑی ہو اسے صرف اللہ ہی کے لیے

ہونا بھی چاہیے۔ یہ اخوت کوئی خالی خولی نعرہ نہیں۔

یہ تو اسلامی تعلیمات کے ساتھ وفاداری، اس کی ہدایات کو نافذ کرنے اور پھیلانے کی روحانی و مادی شرکت کا نام ہے چاہے اس میں جو بھی مشکل اور پریشانی اٹھانی پڑے اور چاہے اس کی راہ میں کسی ہی مسرت انگیز یا المناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی حدیثوں میں دینی مقاصد کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ ہی کے لیے اخوت قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے کیوں کہ تھی یہ امت اپنے مفوضہ پیغام کی مخلص اور اس کے لیے کوشاں ہو سکتی ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تین باتیں جس میں بھی ہوں گی وہ ایمان کا مزا اور حلاوت پائے گا۔

یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک باقی تمام چیزوں سے زیادہ

محبوب ہوں۔

یہ کہ وہ اللہ ہی کے لیے محبت کرے اور اسی کے لیے نفرت کرے۔

اور یہ کہ آگ کا بڑا الاؤ دہکایا جائے اور پھر وہ اس میں گر پڑے۔ یہ اسے اس سے زیادہ پسند ہو کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائے۔“ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سایہ میں رکھے گا جب اس کے سوا

کوئی اور سایہ نہیں ہوگا۔“

امام عادل، وہ نوجوان جس کی اٹھان ہی اللہ کی عبادت میں ہوتی ہو، وہ آدمی

جس کا دل مسجد ہی سے معلق رہتا ہو، ایسے دو شخص جنہوں نے اللہ کے لیے محبت کی

اسی کے لیے اکٹھا ہوئے اور اسی کے لیے جد ہو گئے، وہ آدمی جسے کسی منصب اور حسن

والی عورت نے بلایا ہو اور اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ہو کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں،

وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ کیا ہو اور اسے اس طرح چھپایا ہو کہ اس کا بایاں ہاتھ بھی

نہ جان سکے کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا، اور وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد

کیا ہو اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہوں“ (بخاری)

حضرت ابو درداءؓ کی روایت میں ہے:

”و آدمی جب غائبانہ طور پر اللہ کے لیے باہم محبت رکھتے ہیں تو ان میں سے جو اپنے ساتھی سے زیادہ شدید محبت رکھتا ہے وہ اللہ کو زیادہ پسند ہوتا ہے“
حضرت ابو ادریس خولانیؓ کی روایت ہے کہ میں دمشق کی مسجد میں گیا تو دیکھا ایک چمکیلے و انتوں والے شخص موجود ہیں اور کچھ لوگ ان کے ساتھ ہیں جب کسی چیز میں اختلاف رائے ہوتا ہے تو ان سے رجوع کرتے ہیں اور ان کی بات مان لیتے ہیں۔
میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا حضرت معاذ بن جبل ہیں۔

دوسرے دن میں دو پہر میں پہنچا تو وہ پہلے ہی سے پہنچ چکے تھے اور نماز پڑھ رہے تھے میں انتظار کرتا رہا جب وہ نماز پوری کر چکے تو میں سامنے سے آیا، سلام کیا اور عرض کیا:

”میں آپ سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں، انہوں نے فرمایا کیا واقعی اللہ کے لیے؟“

میں نے عرض کیا (ہاں) اللہ کے لیے، تو انہوں نے میری چادر کا کونا پکڑا اور فرمایا: تمہیں خوشخبری ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”میری محبت واجب ہوگئی ان لوگوں کے لیے جو میرے لیے باہم محبت کرتے ہیں، میرے لیے باہم مل بیٹھتے ہیں، میرے لیے ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور میرے لیے باہم خرچ کرتے ہیں“ (مالک)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں:

جس کا اسلام میں کوئی حصہ ہو اسے اللہ اس شخص جیسا نہیں بنانا جس کا کوئی حصہ نہ ہو۔ اور اسلام کے حصے تین ہیں: نماز، روزہ اور زکاۃ۔“

اور اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی شخص کو دوست بنانا ہے تو قیامت کے دن اسے
 کسی دوسرے کے سپرد نہیں کرتا۔
 اور جو شخص کسی قوم کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے انھیں کے ساتھ کر دیتا
 ہے۔ (احمد)



اسلامی اخوت دو بنیادوں پر قائم ہے؛
 ایک مقدس پیغام جو پروردگارِ عالم کی طرف سے نازل ہوا۔
 ہر میدان میں اس پیغام کے لیے جدوجہد کے سلسلے میں باہم تعاون کرنیوالی
 امت۔ اس اخوت کے زبردست مثبت اثرات ہوتے ہیں۔
 اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا امتِ اسلامیہ میں فرد ریاست میں فنا و
 ضم ہو جاتا ہے؟ اس کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت برقرار نہیں رہ جاتی ہے جیسا کہ کمیونٹ
 مالک میں ہوتا ہے؟ یا ریاست فرد کی خادم بن کر رہ جاتی ہے جیسا کہ جمہوری ممالک کا حال ہے؟
 اسلام ایک آسمانی شریعت کا نام ہے جس کا مقابلہ زمینی نظریات سے نہیں
 کیا جاسکتا پھر بھی ہم چاہیں گے کہ فطرت کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کر دیں تاکہ لوگوں
 کو معلوم ہو جائے کہ ان کے لیے بھلائی کی کتنی ضمانت دی گئی ہے۔
 اسلام نے انسان کو انتہائی عزت بخشی ہے بلکہ اسے ناز برداری تک پہنچا دیا ہے۔
 اسے اس وسیع عالم کا مالک بنایا ہے اور اس کے ہاتھ میں اس کے خزانوں کی
 کنجی دے دی ہے۔

اسے عقل و دانش کی قیمت و اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے یہ ہدایت بھی کر دی
 ہے کہ فکر و نظر کے دریاؤں میں ہاتھ پیر مارو لیکن اس سے چوکتا رہو کہ کہیں ڈوب
 نہ جاؤ۔

اس نے آسمان وزمین کی چیزوں پر غور کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا
 موقع دیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام خواہشِ نفس، سرکشی اور جرم کی آزادی نہیں دیتا لیکن یہ آزادی کو پابند کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی حدود قائم کرنا ہے تاکہ تمام انسان آزادی میں اپنا حصہ پاسکیں۔ کسی مخلوق کی آزادی اس لیے کم نہ ہو کہ دوسری مخلوق نے اپنے حق سے زیادہ آزادی غصب کر لی ہے۔

انسان کی ناز برداری کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جنگ اور مستقبل سے تعلق رکھنے والے معاملات میں، جہاں ریاست فرد کی آزادی کا حق ضبط کر لیتی ہے اسلام انسان کی عزت کو برقرار رکھتا ہے۔

حضرت حذیفہ بن الیمان کی روایت ہے کہ مجھے غزوہ بدر میں شرکت کرنے سے صرف اس بات نے روک دیا کہ میں ابو حیل کے ساتھ نکلا تو کفار قریش نے ہمیں پکڑ لیا۔

انہوں نے کہا: تم لوگ محمدؐ سے ملنے جا رہے ہو۔؟

ہم نے کہا: نہیں ہم صرف مدینہ جانا چاہتے ہیں۔

تب انہوں نے یہ عہد و پیمان لے کر ہمیں چھوڑا کہ ہم مدینہ چلے جائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو یہ بات آپ کو بتائی۔

آپ نے فرمایا: تم دونوں لوٹ جاؤ۔ ہم ان کے ساتھ کیا گیا عہد و پیمان پورا

کریں گے اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں گے۔ (مسلم)

کیسی حیرت ناک بات ہے؟؟؟ ایک عام مسلمان ایک بات کہتا ہے اور

ریاست اسے شرمندہ نہیں ہونے دیتی بلکہ اس کی عزت و احترام کی حفاظت کرتی ہے۔

اور یہ اس صورت حال میں ہے جب محرکہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد اپنے دشمن

کے مقابلے میں صرف ایک تہائی ہے اور ایک ایک فرد کی انتہائی اہمیت ہے۔

تب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کو اپنے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لینے

دیتے اور لوٹا دیتے ہیں۔

پھر عہد کی اس پابندی کو ذاتی مسلک نہیں بناتے بلکہ اسے ریاست کا کردار بنا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم اس عہد کو پورا کریں گے۔

دنیا بھر کے کسی فرد کو کسی بھی جمہوری نظام میں یہ عزت کبھی حاصل ہوئی ہے؟ حضرت خدیجہؓ ہی کی طرح ایک عورت کے ساتھ بھی معاملہ پیش آتا ہے۔ حضرت اُمّ ہانیؓ ابوطالب معرکہ بدر کے بعد دو مشرکین کو اپنے یہاں پناہ دے دیتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اُمّ ہانی اتم نے جنہیں پناہ دی ہے ہم نے بھی انہیں پناہ دے دی۔

فتوحات کے دوران کسی معرکہ میں ایک مسلمان غلام نے محصور مشرکین کو امان کی پیش کش کر دی اور انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ ایک غلام کے اس اقدام پر مسلمانوں میں اختلاف رائے پیدا ہوا۔ حضرت عمرؓ کے کانوں تک بات پہنچی تو آپ نے اس امان کو برقرار رکھنے کا حکم دیا اور اس طرح غلام کی بات کا احترام کیا۔ ایک اونی مسلمان کی ذمہ داری کا پاس بھی مسلمان کیا کرتے تھے۔



اسلام نے جہاں فرد کو یہ باعزت آزادی دی ہے وہیں اس کی ظالمانہ خواہشات کو جدو میں رکھنے کی کوشش بھی کی ہے تاکہ یہ آزادی سرکشی و اسراف تک نہ پہنچ جائے۔

فرد کو اس پیغام کے مقاصد کے تابع بنایا گیا ہے جس پر معاشرے کی بنیاد ہے اور جس کے نظام کو نافعہ کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔

فرد اس طرح ریاست میں ہضم نہیں ہو جاتا جیسے ریاست کوئی نیابت ہو اور رعایا کی حیثیت اس کے جانثار پجاریوں کی ہو۔

اسلام میں ریاست کی حیثیت اسلام اور اس کے اعلیٰ انسانی مقاصد کے محافظ کی ہوتی ہے انہیں مقاصد کے لیے وہ ہر فرد سے جان و مال کی قربانی طلب کرتی ہے۔

اور اس سچے جذبے کی بدولت اسے ہر میدان میں رہنمائی کا حق حاصل ہوتا ہے۔
اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص اپنے کو اتنا با اختیار قرار دے کہ
دوسرے لوگوں کو اپنے اشاروں پر چلانے لگے۔

اسلام میں جو حکومتی ڈھانچہ پایا جاتا ہے اس کا کام اللہ تعالیٰ کے احکام کی
سر بلندی کے لیے لوگوں کی رہنمائی ہے۔

اور اس ڈھانچے کا یہ حق ہوتا ہے کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے اور اس
کی رہنمائی کو قبول کیا جائے۔ یعنی فرد اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کا مکلف ہوتا ہے
اس سے بچھا نہیں چھڑا سکتا۔

اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا
مال خرید لیا اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت
ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے
ہیں اور مرتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ
وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ
يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ
وَيُقْتَلُونَ (التوبة - ۱۱۱)

اہل ایمان وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول
پر یقین لائے اور جب اس کے ساتھ ہوتے
ہیں کسی جمع ہونے والے کام میں تو جب تک
اس سے اجازت نہ لے لیں چلے نہیں جاتے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ
وَرَسُولِهِ إِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ
أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ
يَسْأَلُوهُ (النور - ۶۲)

ایمان والوں کی بات تو یہ ہے کہ جب ان کو
اللہ اور رسول کی طرف ان میں فیصلہ کرنے
کو بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سن لیا اور

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا
إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ
أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا۔

مان لیا۔

(النور - ۵۱)

اس کا مفہوم ریاست میں فرد کا گم ہو جانا اس کی اپنی شخصیت اور اس کی
صلاحیتوں کی نفی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو کسی بھی انسان کا حقیقی و لازمی موقف ہونا چاہیے۔
ایسی حالت میں ریاست کے سامنے فرد کی خود سپردگی اللہ کی اطاعت اس کی

خوشنودی کے حصول اور روئے زمین پر اس کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کا حصہ ہے۔
 آج کے بعض معاشی نظام جس طرح فرد کی شخصیت اور اس کی ذاتی آزادی کو
 سلب کرتے ہیں اس سے دل میں خوف و دہشت اور نفرت کی فضا پیدا ہوتی ہے
 اس میں شریفانہ شوق و تحریک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

اسلام اس طرح کی صورت حال تسلیم نہیں کرتا وہ عمل کو بدیتی سے پاک کرتا ہے
 اور اسے خالصتاً اللہ کے لیے بناتا ہے۔ وہ کسی بھی انسان کی رضا جوئی کے لیے عمل کو سرد
 کر دیتا ہے۔

اسلام کسی بھی شخص کو ایسا حاکم تسلیم نہیں کرتا جو عوام و خواص کو تخریر کرنے کا بذات
 خود رجحان رکھتا ہو یا مخلوق پر اپنی مرضی مسلط کرے کیونکہ اس طرح کی حاکمیت اللہ تعالیٰ
 کے لیے بے کسی انسان کے لیے نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے حاکم کو مشورہ لینے اور لوگوں کو اسے
 مشورہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

اگر حاکم غلطی کرتا ہے تو قوم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کرے۔
 حاکم و محکوم دونوں ہی جامع عقائد و احکام کے تابع ہیں ان سے تجاوز نہیں کر سکتے۔
 اسلام ریاست اور فرد دونوں کو اتنا ہی اختیار دیتا ہے جس سے فرد کی انسانی عزت
 اور ذاتی خصوصیات کے تحفظ میں خلل نہ پڑے اور آسمانی پیغام اور حق کا جھنڈا
 سر بلند ہو۔

حدود (سزائیں)

کیا اسلام نے ہر غلطی کے لیے فوری سزا کی ہدایت کی ہے؟
نہیں۔ لوگ کتنی ہی غلطیاں کرتے ہیں جن پر صرف نصیحت و تلقین یا دانٹ پھٹکار
سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاتا۔

کفر کی مثال لیجئے جو سب سے بڑی اور سنگین غلطی ہے۔
اسلام نے اس کی کوئی سزا مقرر نہیں کی۔ بلکہ کافر کو صرف ایک غلط کار شخص
قرار دیا جب تک وہ کسی جارحیت یا ایذا رسانی کا ذریعہ نہیں بنتا، وہ مسلمانوں کے
ساتھ پورے حقوق اور ضمانتوں کے ساتھ رہے گا۔

والدین کی نافرمانی اور سو و خوری جیسی بہت سی غلطیاں ہیں جنہیں اسلام شدید
جرم مانتا ہے لیکن ان کی کوئی خاص سزا مقرر نہیں کی۔

صرف قتل، زنا، چوری، بے گناہ عورتوں پر تہمت لگانا اور نشہ ہی ایسے جرائم
ہیں جن کے لیے اسلام نے سزائیں مقرر کی ہیں اور ان کی روک تھام اور ان کے مرتکبین
کی سزا کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔

آج جب ہم جان و مال اور عزت و آبرو کے لیٹرے بھیسٹر پولوں کے ہاتھوں لگنے
والے زخموں سے کراہ رہے ہیں۔ ان الہی احکام کے نفاذ سے قائم ہونے والے انصاف
کی اہمیت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

لیکن ایسا لگتا ہے کہ بیشتر لوگ یہ نہیں جانتے کہ سزائیں (حدود) کب دی جاتی

ہیں اور مجرموں کی گردن کب پکڑی جاتی ہے۔

اگر وہ حقیقت سمجھ جائیں تو ان کا دل حکم الہی پر مطمئن ہو جائے اور وہ جان جائیں کہ وہ انصاف کا تقاضا بھی ہے اور رحمت کا بھی۔

انسان طبعی طور پر خطا کار ہے اور اس کی غلطیوں کا نقصان اس کی ذات کے علاوہ معاشرے کو بھی پہنچتا ہے۔

جہاں تک خطا کار کی اپنی ذات کا تعلق ہے اسے توبہ کرنے اور زیادہ بہتر طرز عمل اختیار کرنے کا موقع ملنا چاہیے اور جہاں تک معاشرے کا تعلق ہے یہ اس کا حق ہے کہ اندھے پن کے رجحانات سے اس کے وجود کی حفاظت کی جائے اور معاشرے کے بے گناہ و معصوم لوگوں کو نقصان سے تحفظ فراہم کیا جائے۔

اسلام دونوں پہلوؤں کا لحاظ کرتا ہے کسی ایک پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ خطا کار کو اپنی خطا سے رجوع اور تلافی کے لیے جتنی آسانی اسلام فراہم کرتا ہے اتنی کوئی اور دین یا نظام فراہم نہیں کرتا۔

لیکن اگر کوئی شخص پاگل کتابن جائے تو اسے آزاد چھوڑنا معاشرے کے لیے نقصان دہ ہوگا اور اسے سزا دینے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں رہ جائے گا۔

مسلمان اس پر متفق ہیں کہ کتاب و سنت سے جو سزائیں ثابت ہیں ان کا نفاذ لازم ہے۔

چوری اور دیکھتی

معاشرہ میں امن و امان کا بول بالا بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ کتنی خوش بختی کی بات ہے کہ انسان جان و مال اور آبرو کے تعلق سے کسی طرح کی تشویش اور اندیشہ کے بغیر جہاں چاہے آئے جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب مکہ مکرمہ میں آبادی کی بنیاد ڈالتے ہوئے پروردگار سے دعا کی تھی تو اس میں دو چیزیں طلب کی تھیں رزق کی ضمانت اور مستحکم امن اور اس کو رزق پر ترجیح دی ہے۔

رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ
أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ۔

اے میرے رب اس شہر کو امن کا شہر بنا دے
اور اس کے باشندوں کو ہر قسم کے پھلوں کا

(البقرہ - ۱۱۲۶) رزق دے۔

امن و امان کا بول بالا ہو اور ہر انسان اطمینان سے رہ سکے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے احکام دیے ہیں۔ ایک اہم حکم چوری کی سزا کا ہے۔ بلاشبہ چوری ایک ایسا سنگین جرم ہے جس کا استیصال کیا جانا چاہیے، اس کا وجود ہی پریشان کن ہے چھ جائیکہ کہ وہ عام ہو جائے۔

آپ اس مزدور کا تصور کیجیے جو اپنے بال بچوں کے لیے پورے مہینے کھٹتا ہے پھر مہینے کے آخری دن بڑے شوق سے اپنی تنخواہ لے کر گھر لوٹتا ہے اور راستے بھر سوچتا جاتا ہے کہ کون کون سی ضرورت کس کس طرح پوری کی جائے۔ اچانک کوئی اچکارا راستے میں اس کی پوری تنخواہ اچک لیتا ہے۔ اب وہ کیا کرے اور کیا کہے؟

اس چور کو کیسے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ لوگوں کی اتنی مشقت کی کمائی کو ہڑپ کرتا رہے۔
 میں ایک ایسے ملازم کو جانتا ہوں جو دو سال کے لیے ملک سے باہر چلا گیا
 کہ کچھ کماتا کر اپنا گھر بنا سکے پھر اس میں اپنی بیوی کے ساتھ آرام سے رہ سکے اچانک
 ایک دن نقتب زونوں نے گھر میں نقتب لگا کر سارا سامان لوٹ لیا۔
 ایک کسان نے بڑی جانفشانی سے فصل تیار کی لیکن اسے سینے کے بعد گھر بوٹتے
 ہوئے چوروں نے سارا روپیہ چھین لیا۔

اس طرح کام نہ کرنے والے خبیث مشقت سے کمانے والوں کی کمائی ہڑپ
 کر جاتے ہیں پھر یہ کہیں لوگ لوٹی ہوئی دولت کو بے دریغ خرچ کر کے عیش بوٹتے ہیں۔
 انہوں نے کوئی مشقت تو جھیلی نہیں ہوتی کہ انہیں خرچ کرنے میں کچھ سوچنا پڑے۔
 بلاشبہ معاشرے پر لازم ہے کہ اس طرح کے لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرے اور
 انہیں ایسی سزا دے کہ خود وہ بھی اُٹندہ ایسا نہ کر سکیں اور دور و نزدیک کے دوسرے
 لوگ بھی ڈر جائیں۔

اسلام کی نگاہ میں ہاتھ میں طرح کے ہی ہوتے ہیں:

ایک وہ ہاتھ جو کام کرتا ہے۔ اس کا حق ہے کہ اسے تحفظ فراہم کیا جائے، اس کی
 جوصلہ افزائی کی جائے، اس کی راہ میں درپیش مشکلات کا ازالہ کیا جائے اور پورا اطمینان
 مہیا کیا جائے۔

ایک ہاتھ بیکار ہوتا ہے۔ اس کا حق ہے کہ اسے کام فراہم کیا جائے تاکہ وہ باعزت
 زندگی گزار سکے اور زندگی میں اپنا فطری حق حاصل کر سکے۔ اسے بھیک مانگنے یا چوری
 کرنے پر مجبور کرنا درست نہیں۔

تیسرا ہاتھ بگڑا ہوا ہاتھ ہوتا ہے جو باعزت کام نہیں کرنا چاہتا بلکہ لوگوں کو تکلیف
 پہنچانا چاہتا ہے۔ حلال و حرام اور خوب ناخوب جاننے کے باوجود سدھرتا نہیں۔
 اسلام اس ہاتھ کو کیا کرے سوائے اس کے کہ اسے کاٹ دینے کی ہدایت دے تاکہ
 اس ہاتھ والے کو اور سائے میں پورے معاشرے کو راحت مل جائے۔

جو لوگ اس ہاتھ کو باقی رکھنے کے حامی ہیں ہم ان سے پوچھیں گے کہ آٹروہ چاہتے کیا ہیں؟ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ کچھ دن کے لیے جیل میں رکھ کر چھوڑ دیا جائے تو ہم دریافت کریں گے کہ اگر وہ جیل سے نکل کر پھر وہی کرنے لگے تب کیا ہوگا؟ اس طرح کی بات کوئی مخلص اور غیرت مند آدمی نہیں کہہ سکتا۔

سزا کے نفاذ میں جلد بازی کا مسئلہ دوسرا ہے اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں سزا تو دینی اعتبار سے اسی وقت نافذ کی جاسکتی ہے جب قاضی کا دل بالکل مطمئن ہو جائے کہ مجرم سحت بھوک کا شکار ہونے کی حالت میں یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے وہ جرم نہیں کر بیٹھا تھا۔

ہاتھ تو وہی کاٹا جائے گا جو معاشرے پر ظلم کر رہا ہو نہ کہ وہ ہاتھ جس پر خود معاشرے نے ظلم کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا
أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَا
تَكَالًا مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ
فَمَنْ تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ
فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ
اور چور خواہ مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ
کاٹ دو یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور الشَّرْكَ
طرف سے عبرتناک سزا۔ اللہ کی قدرت
سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے پھر
جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح
کر لے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل
ہو جائے گی۔

(الماندة - ۳۸ - ۳۹)

جن ملکوں میں چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ ہوئی وہاں چوری تقریباً معدوم ہو گئی ایک ہاتھ کے کاٹنے سے بہت سے ایسے جیل خانے کھولنے کی ضرورت ختم ہوئی جہاں رہ کر مجرم اور سحت مجرم بن کر نکلا کرتے تھے۔

دوسرے کا مال ہڑپ کرنا ایسا جرم ہے جو وہیں تک بس نہیں کرتا بلکہ خوں ریزی تک پہنچا دیتا ہے چوری کرتے وقت چور کے راستے میں جو شخص بھی حائل ہوگا وہ اسے مار ڈالنے کی کوشش کر سکتا ہے چاہے وہ سامان کا مالک ہو یا چوکیدار و محافظ۔

پھر ایک چور اپنے مقصد کے حصول کے لیے دوسرے چور کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ اس طرح چوروں، ڈاکوؤں اور رہزموں کے گروہ بن جاتے ہیں جو باقاعدہ منصوبہ بنا کر لوٹ مار کرتے ہیں اور آپس میں کام تقسیم کر لیتے ہیں جیل خانے اکثر اس طرح کے منصوبوں کی تیاری میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

سلاح ڈاکو، ریل گاڑیوں پر، بسوں اور کاروں پر، دکانوں اور کارخانوں پر یہاں تک کہ کھیتوں اور کھلیانوں پر حملے کرنے لگتے ہیں۔

پھر تعجب اس پر ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان سے ہمدردی جتانے لگتے ہیں اور گوشش کرتے ہیں کہ ان کی سزائیں تخفیف ہو جائے۔

اس طرح کے لوگوں کے ضمیر کے بارے میں مجھے زبردست شک ہوتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ چور سے ہمدردی تو چوری کر سکتا ہے اور قاتل کے لیے درد مندی قاتل ہی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔

اسلام تو فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے:

انَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا
أَنْ يُقْتَلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ
وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ
الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا
وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ
أَنْ تَمْدُرُوا عَلَيْهِمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
عَفُورٌ رَحِيمٌ۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور
زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد
برپا کریں ان کی سزایہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا
ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ
ڈالے جائیں یا جلا وطن کر دیے جائیں یہ ذلت
ورسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت
میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے مگر جو
لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر تباہ
پاؤ تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف
کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

(المائدہ - ۳۳ - ۳۴)

یہاں تین باتوں کا لحاظ ناگزیر ہے:

۱۔ لوگوں کے مال کا تحفظ ضروری ہے۔ بے کار بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف سے غلط طریقوں سے مال حاصل کرنے کی خواہش کا سدباب بھی ضروری ہے اور آسمانی سزائیں اس کی بہت بڑی ضمانت ہیں۔

۲۔ جو لوگ انتشار پھیلاتے ہیں اور حقوق کو پامال کرتے ہیں ان کے لیے رحم کی گنجائش نہیں، انہیں چھوڑ دینا پورے معاشرے کے لیے مصیبتوں کا دروازہ کھول دینا، ظلم کو شہہ دینا اور اقدار کو پامال کرنا ہے۔

۳۔ اگر غلطی عارضی طور پر ہو جائے تو شریعت درگزر کرنے اور توبہ و رجوع کو آسان بنانے کی اولین حامی ہے کیونکہ اس کا اصول ہے کہ ”امام معاف کرنے میں غلطی کر جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ سزا دینے میں غلطی کر جائے“

لیکن سزاؤں کو معطل کر دینے اور ان کے نفاذ میں باریک بینی سے کام لینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کچھ لوگ یہ غلط بیانی کرتے ہیں کہ ہاتھ کاٹنے سے لوگ کام کرنے سے معذور ہو جائیں گے لیکن یہ مضحکہ خیز دلیل ہے چودہ سو برسوں کے دوران اس سزا سے فائدہ ہی پہنچا ہے نقصان نہیں۔ معاشرے میں شاذ و نادر ہی اس کی نوبت آتی ہے کیونکہ ہاتھ کاٹنے کی دہشت چوروں کو چوری سے باز رہنے اور جائز طریقوں سے روزی کمانے پر آمادہ کرتی ہے۔

زنا اور تہمت

اسلامی معاشرہ — جہاں تک جنسی پہلو کا تعلق ہے — کیونٹ اور سرمایہ پرست معاشروں کے بالکل برعکس ہے۔

ان معاشروں میں جنسی اتصال جسم کا تقاضا ہے۔ اخلاق و کردار، روحانیت اور ایمان و عبادت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

لیکن ہم مسلمان جنسی تعلقات کو دینی تعلیمات سے جوڑتے ہیں۔ اور پاکیزگی اور عفت کے دائرے میں محدود رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَفْوَاجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ
 أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ
 غَيْرُ مَلْكُومِينَ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ
 فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْهَادُونَ۔ (المومنون ۵-۷)

اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں
 مگر اپنی عورتوں یا اپنی باندیوں سے سوا
 پر کچھ الزام نہیں پھر جو کوئی اس کے سوا
 ڈھونڈھے وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

جنسی خواہش کی تسکین کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق عقدِ شرعی۔ اب صرف اسی صورت میں ازدواجی تعلق ہو سکتا ہے۔

گھر کے اندر عورت زیب و زینت اختیار کر سکتی ہے لیکن گھر کے باہر جذبات کو مشتعل کرنا اور لذت پرستی کی جو صورتیں اباحت پسندوں نے ایجاد کر رکھی ہیں اور مردوں اور عورتوں کو جس فتنہ انگیز راستے پر ڈال رکھا ہے وہ قابلِ ملامت ہیں جیسے آزادانہ اختلاط، مرد عورت کا باہمی رقص، فحش ڈرامے اور جانوروں کی طرح جنسی ملاپ جس کا

اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ مشتعل جذبات کی آگ کسی بھی طرح ٹھنڈی کی جائے۔

اسلامی معاشرہ اس کے بالکل مخالف ہے۔ وہ زنا اور اس کی طرف بے جا جانے والی تمام چیزوں کو ناپسند کرتا ہے اس نے زانیوں کے لیے سخت سزائیں مقرر کر رکھی ہیں زنا اور شادی شدہ کے لیے سو کوڑے اور شادی شدہ کے لیے سنگسار کرنا (بلاشبہ یہ سزائیں سخت ہیں لیکن منصفانہ ہیں۔

پھر ان سزاؤں کے نفاذ کے سلسلے میں اسلام نے انتہائی احتیاط سے کام لینا لازم قرار دیا ہے۔ ایسے چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے جنہوں نے بچشم خود دیکھا ہو جبکہ یہ جرم عام طور پر چھپ کر کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں چار گواہوں کا پایا جانا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ گواہی کی بنیاد پر اس سزا کا نفاذ اتنا کم ہوا ہے کہ بعض لوگ تو اسے محض ڈرانے کے لیے سمجھتے ہیں۔

بلاشبہ اسلام نے زنا کا جرم ثابت کرنے میں بہت سخت احتیاط لازمی قرار دی ہے کیونکہ اس کے بہت سخت اور وسیع معاشرتی نتائج نکلتے ہیں۔ زنا کا اثر دو خاندانوں پر ایک ساتھ پڑتا ہے اور دونوں خاندانوں کو معنوی اور مادی تکلیفیں پہنچتی ہیں۔

ہاں امریکہ، یورپ اور ان کے مقلد ممالک میں ماحول اتنا گندا ہو چکا ہے اور لوگ اتنے گر چکے ہیں کہ جانوروں کی طرح باغوں میں اور سڑکوں تک پر زنا کرنے میں نہیں شرماتے۔ وہاں اس طرح کا جرم گواہی کی بنیاد پر ثابت ہونا آسان ہے۔

اسلام یقینی طور پر معاشرے میں پاکیزگی کا ماحول پیدا کرنے میں سزا پر انحصار نہیں کرتا بلکہ دیوں میں ایمان پیدا کرنے اور ضمیر کی اس طرح تربیت کرنے پر انحصار کرتا ہے جس سے اللہ کا ڈر پیدا ہو اور موقع ملنے کے باوجود اس طرح کے گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔

پھر اسلام نے اس کے لیے سازگار ماحول بھی پیدا کرنے کی کوشش کی:

○ عورت کو باوقار لباس پہننے کی ہدایت کی جس سے اس کا جسم محفوظ ہو سکے۔

○ نگاہیں نیچی رکھنے اور نامحرم عورتوں کی طرف نہ دیکھنے کی ہدایت کی۔

○ مرد اور عورت کے درمیان خلوت کو ممنوع قرار دیا۔
○ مسجدوں تک میں مردوں اور عورتوں کی الگ الگ اور دور دور صفیں قائم کرنے کا انتظام کیا۔

○ مخلوط تعلیم کی اجازت نہیں دی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ اسکول اور کالج ہونے چاہئیں۔

○ شادی کو آسان بنایا اور معاشرے میں اسے تکلف سے دور رکھ کر عام عادت بنایا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ عینی تعلقات کے سلسلے میں اسلامی طرزِ عمل اور یہاں وہاں سے درآمد زوال آمادہ طرزِ عمل میں زمین اور آسمان کا فرق ہے غیر اسلامی طرزِ عمل یہاں تک پہنچا کہ فریقین کی رضامندی سے زنا قانوناً ناجائز نہیں رہ گیا اور ادھر ادھر پھینکے ہوئے بچوں کے سلسلے میں یہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں رہ گئی کہ وہ کہاں سے آئے؟

ہم مسلمان اس طرزِ عمل کو مسترد کرتے ہیں، زنا کو ایک جہلک برائی مانتے ہیں اور وہاں تک پہنچانے والے تمام دروازے بند کرنے پر زور دیتے ہیں پھر جرم سرزد ہوجانے کی صورت میں کوڑے یا سنگساری کی سزا دیتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ خاندان ہی شریف لوگوں کے لیے ملنے کی جائز جگہ ہے۔

جس طرح اسلام آبرو کے تحفظ پر زور دیتا ہے اسی طرح کسی کی بے حرمتی کو بھی ناپسند کرتا ہے اور اس پر سزا دیتا ہے۔

لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کے خلاف تہمت طرازی اور انہیں رسوا کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

اس طرح کے لوگوں کو دوسروں کی آبرو سے کھیلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا اسلام ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ یا تو چار گواہ پیش کریں ورنہ انہی کوڑے سزا کے طور پر کھائیں۔

اس طرح کے تہمت طرازوں کو سزا دینا اور انہیں ہمیشہ کے لیے جھوٹا قرار دے کر ان کی گواہی کو تسلیم نہ کرنا بلاشبہ ایک سخت سزا ہے لیکن نہایت منصفانہ بھی ہے تہمت طرازی کی روک تھام بھی ہو سکتی ہے۔

شریف عورتوں کے لیے ضمانت ہونی چاہیے کہ وہ سکون و اطمینان سے زندگی گزار سکیں۔ پھر یہ بھی قابلِ توجہ بات ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ غلطی اپنی جگہ ختم ہو جائے۔ کوئی پھر اس کے بارے میں گفتگو نہ کرے اور نہ ہر جگہ لوگ اسے زبان کا پٹخارہ بنائیں۔ فرض کر لیا جائے کہ کسی شخص نے تنہا کوئی جنسی جرم ہوتے دیکھا تو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی اور سے اس کا تذکرہ کرے۔ کون جانتا ہے کہ یہ پوشیدہ رکھنا خطا کاروں کے لیے توبہ اور پاکیزگی کا ذریعہ بن جائے۔

دین اس کے انتظار میں نہیں رہتا کہ بس کوئی قدم لڑھکھڑائے اور جھٹ کرنے والے

کو جکڑ لے۔

اور اگر اللہ لوگوں کی کمائی پر ان کو پکڑے تو زمین پر ایک بھی پلنے جلنے والا نہ چھوڑے۔

وَلَوْ يَوَاقِدُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا
مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرهَا مِنْ دَابِّيَةٍ۔

(مناظر - ۱۲۵)

دین اس کا پورا موقع دیتا ہے کہ پر وہ پوشی ہوتا کہ بھٹکا ہوا آدمی راہِ راست پر آجائے اسی لیے مومن پر یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ گندی افواہوں سے اپنے کان بند رکھے اور جب تک کسی کے پاس کافی ثبوت نہ ہو۔ جو بہت دشوار ہے۔ اس کو جھوٹا قرار دیا جائے۔

کیوں نہ جب تم نے اس کو سنا تھا تو ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر بھلا خیال کیا ہوتا اور کہا ہوتا کہ یہ صریح ظوفان ہے۔ کیوں نہ وہ اس بات پر چار گواہ لائے پھر جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ
وَالْمُؤْمِنَاتُ بِنَفْسِهِمْ خَيْرًا
وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ لَوْلَا
جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ
أَنْتُمْ يَاقُوتَا بِأَشْهَادٍ فَادْعَكُمُ

عِنْدَ اللَّهِ هُمْ الْكَاذِبُونَ۔
کے یہاں وہی لوگ جھوٹے ہیں۔

(النور۔ ۱۲-۱۳)

ظاہر ہے اسلام اس جرم سے نفرت کرتا ہے اور اس پر دنیا و آخرت میں رسوائی و بربادی کی دھمکی دیتا ہے۔ ساتھ ہی ان لوگوں کو بھی دھمکی دیتا ہے جو چھپ کر یہ جرم کرتے ہیں پھر لوگوں کے سامنے شریف و پاکیزہ بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا
أَشِيًّا يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَكَأَنَّهُمْ
يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُمْ مَعَهُمْ
إِذْ يَبَيِّنُونَ مَا لَا يُرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ
وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا۔
اللہ کو دغا باز گنہگار پسند نہیں جو لوگوں سے
شرماتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جبکہ
وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ مشورہ کرتے
ہیں رات کو اس بات کا جس سے اللہ راضی
نہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے
قابو میں ہے۔

(النساء: ۱۰۷-۱۰۸)

اگرچہ دین اس طرح کے عملی منافقین سے نفرت کا اظہار کرتا ہے تاہم وہ چھپے ہوئے گناہ گاروں کی پر وہ پوشی کو ترجیح دیتا ہے اور ان کے لیے امید کے دروازے کھلے رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں۔

اب جس کا سب کچھ طشت ازبام ہی ہو جائے اسے جانور کی طرح پٹنا ہی پڑے گا اور جس سزا کا وہ مستحق ہے اسے ملے گی۔

البتہ اسلام گھرانوں کو اور میاں بیوی کے تعلقات کو خاص نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گمان کو جھوٹ بتایا گیا ہے اور تہمت طراری کو ثبوت کے بغیر وبال کا ذریعہ۔ پھر بھی کبھی شوہر کوئی ایسی بات دیکھ سکتا ہے جسے وہ ثابت بھی نہ کر سکتا، ہو لیکن اسے برداشت بھی نہ کر سکتا ہو۔ یہ معاملہ سنگین نوعیت کا ہو جاتا ہے۔ اب یا تو شوہر جو کچھ کہہ رہا ہے، اس سے پیچھے ہٹنے کی کوئی گنجائش باقی نہ سمجھتا، ہو یا پھر اپنی بیوی پر الزام نہ لگائے مشکوک صورت حال کو ختم کرنے کے لیے لہجہ انکار کا طریقہ بنایا ہے۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَكُنْتُمْ

اور جو لوگ اپنی بیویوں کو عیب لگائیں اور

شراب و منشیات

شراب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو عقل پر چھا جائے اور اسے متاثر کر دے، چاہے وہ کسی مشروب کی شکل میں ہو یا ایون اور چرس جیسی خشک چیز کے روپ میں۔ کچھ لوگ صرف انگور، جو اور گنے وغیرہ کے رس سے بنائی ہوئی نشہ آور شراب ہی کو شراب سمجھتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے، جن قوموں میں سیال شراب کا رواج عام ہے ان کی حالت ان قوموں سے بہتر ہے جن میں ایون، چرس جیسی منشیات کا رواج ہے۔

پھر یہ خیال احمقانہ ہوگا کہ کم نقصان والی چیز کو تو شریعت ممنوع قرار دے اور زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز پر پابندی نہ لگائے۔ شراب کے بارے میں قدیم زمانے سے جانا جاتا ہے کہ وہ ذہن کو معطل اور اس کی صلاحیتوں کو متاثر کرتی ہے جس سے انسان اپنے باعزت درجے سے گر جاتا ہے اور اپنی وہ بہترین ذہانت کھو دیتا ہے جس کی بدولت وہ دوسری مخلوقات پر امتیاز رکھتا ہے۔

قرآن کریم شراب کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کے ذہنی و نفسیاتی برے اثرات کا ذکر کرتا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ
 شیطاں تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تم میں دشمنی اور بیزاری اور

وَيَصِدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَمَنِ
 تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روکے۔

الصَّلَاةِ - (المائدة - ۹۱)

آدمی اگر اپنے ذہن کی رو بے لگام چھوڑ دے تو اس کے جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں اسی لیے شرابی بسا اوقات جانوروں جیسی حرکات کرنے لگتا ہے۔
 بہت سی قومیں منشیات کو اپنے حال و مستقبل کے لیے مضر سمجھنے لگی ہیں اور اسی لیے ان کی روک تھام پر انتہائی زور لگایا گیا ہے، بعض ممالک نے تو منشیات استعمال کرنے اور اسے پھیلانے کی سزا پھانسی مقرر کر دی ہے پھر منشیات کے مضر اثرات کے بارے میں کافی شور شرابا مچایا جا رہا ہے۔

لوگوں کی حالت بھی عجیب ہے، مثلاً وہ یقین رکھتے ہیں کہ تمباکو نوشی کا کوئی فائدہ نہیں، صحت اور پیسے کی بربادی کے علاوہ اس سے خونناک امراض پیدا ہوتے ہیں لیکن اس احمقانہ عادت میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔

لگتا ہے کہ بعض لوگ وقتی طور پر اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لیے ایسا کرتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس عارضی سکون کے بعد زیادہ تکلیف دہ حالت سامنے آجاتی ہے۔ اور طرح طرح کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم شراب اور جوئے کے بارے میں کہتا ہے:

ان دونوں میں بڑا گناہ اور لوگوں کے لیے
 فائدے بھی ہیں (مگر) ان کا گناہ ان کے
 فائدے سے بہت بڑا ہے۔

فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعٌ لِلنَّاسِ
 وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَمْعِهِمَا۔

(البقرة - ۲۱۹)

یعنی نشہ کرنے والے کو عارضی طور پر سکون یا لذت کا جو احساس ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اس کے نتائج کہیں زیادہ نقصان دہ ہوتے ہیں۔
 اسی طرح جو ابرائی اور دشمنی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے اور غریب اس سے اور بد حال ہو جاتے ہیں۔

رواں صدی کے وسط میں امریکہ نے شراب کے مضر اثرات کا احساس کر کے اس پر

پابندی عائد کرنی چاہی اور اس کے لیے ایک اچھا قانون بھی بنا دیا لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ اس نے اسلام کی طرح تدریجی پابندی کا راستہ نہیں اختیار کیا تھا۔

اسلام منشیات کو حرام قرار دیتا ہے اور نشہ کرنے والے کو ۸۰ کوڑے سزا دیتا ہے کیونکہ نشہ کرنے والے کو اس میں تہمت طرازی تک پہنچ جاتے ہیں اور بے گناہ عورتوں پر تہمت طرازی کی یہی سزا ہے۔

پھر اسلام شراب پینے ہی پر سزا دیتا ہے نشہ پیدا ہونے کی شرط عائد نہیں کرتا۔ جو بھی شراب پی لے گا، چاہے اسے نشہ ہو یا نہ ہو اسے سزا دی جائے گی۔ جو معاشرے منشیات کو کھلی چھوٹ دیے ہوئے ہیں وہ یقیناً تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔

ارتداد

اسلام سے پھر جانا یعنی ارتداد ایسا کرنے والے کا تعلق معاشرے سے کاٹ دیتا ہے اور اس سے زندگی کا حق چھین لیتا ہے۔

کچھ لوگ اس پر کافی شور و غوغا مچاتے ہیں اور اسے آزادی رائے پر پابندی قرار دیتے ہیں ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ چاہے تو ایمان لائے اور چاہے تو انکار کرے۔

کسی بھی انسان کے اس حق کا ہم بھی احترام کرتے ہیں کہ وہ چاہے ایمان لائے یا انکار کرے۔ لیکن یہ حق کسی فرد کو اسی وقت تک حاصل رہتا ہے جب تک اس پر بات واضح نہ ہو۔ اس نے اس معاملہ کا مطالعہ اور جائزہ ہی نہ لیا ہو نہ کوئی رائے قائم کر سکا ہو۔ وہ پوری عمر اسی حالت میں رہ سکتا ہے۔

اگر وہ کسی بھی دوسرے مذہب کو اختیار کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، تب بھی امن و اطمینان سے زندگی گزارنے کا اس کا حق برقرار رہے گا۔

لیکن اگر وہ اسلام کو ترجیح دیتا ہے تو پھر اسے مخلص ہونا چاہیے اور اس کے تمام احکام کو تسلیم کرنا چاہیے۔

کیا یہ آزادی رائے بھی جائے گی کہ اسلام کو ماننے کے بعد اس کے احکام کو پامال کیا جائے؟ یا دوسرے الفاظ میں کیا آزادی رائے کسی انسانی معاشرے میں کسی شخص کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اس معاشرے کی جڑیں ہی کھودنے کی کوشش کرے؟ کیا وطن سے غداری اور دشمنی کے لیے جاسوسی کو آزادی رائے کہا جاسکتا ہے؟

کیا وطن میں انتشار پھیلانا اور اس کے قوانین اور مقدس روایات کو پامال کرنا آزادی
رائے قرار دیا جائے گا؟

ارتداد کے مسئلے کو واضح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اسلام ہر خاص و عام کے سامنے ایک عقیدہ و شریعت کی صورت میں پیش ہے اس
کی کتاب (قرآن کریم) اور اس کے رسول کی سنت سے مثلاً یہ ثابت ہے کہ اللہ ایک ہے
آخرت حق ہے، قصاص حق ہے اور روزہ حق ہے۔

اب جو بھی اسلام کو اختیار کرتا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ ان باتوں کو پسند
کرتا ہے اور انہیں نافذ کرتا ہے۔

اب اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ میں اللہ پر تو ایمان رکھتا ہوں مگر آخرت پر ایمان نہیں
رکھتا، یا ان دونوں پر ایمان ہے مگر روزے یا قصاص کو نہیں مانتا وغیرہ وغیرہ تو کیا
ایسے شخص کو اس طرح خدا کے دین سے کھلواڑ کرنے کی چھوٹ دی جاسکتی ہے؟

یا تو وہ اپنی غلطی سے رجوع کر لے ورنہ اس سے نجات ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے
جو معاشرہ بھی اپنے وجود کا تحفظ کرے اور اس سے کھلواڑ کی اجازت نہ دے اسے مورد الزام
نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

اگر کسی شخص کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے تو یہ اہل علم کی ذمے داری ہے کہ
اسے دور کریں۔

پھر اگر وہ شبہ اس کے دل میں رہتا ہے اس کو پھیلانے کی کوشش نہیں کرتا تو
بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں۔

لیکن اگر کوئی اپنے نظام کے خلاف علم بناوت بلند کرتا ہے مثلاً سود کی تبلیغ کرنے
لگتا ہے تو اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام سے اسے قبول کرنے کی کوشش حماقت ہی ہوگی، اور جو اس کی بنیادوں کو
ٹھکانے پر تلا ہوا ہو اسے زندگی کا حق دینے کا مطالبہ تعجب خیز ہوگا۔

وہ کیا کا کوئی معاشرہ اس غلط طریقے سے خود کشی نہیں کرتا۔ اسی لیے اس میں کوئی

انوکھی بات نہیں ہوگی کہ مرند کو پہلے توبہ کرانے کی کوشش کی جائے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اسے زندگی کے حق سے محروم کر دیا جائے۔

قرآن کریم میں ارتداد کی کوئی متعین سزا واضح طور پر نہیں بیان کی گئی ہے البتہ سنت میں آتا ہے:

”کسی مسلمان کا خون صرف تین صورتوں میں بہانا جائز ہے۔

شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کاری۔

ناحق کسی کی جان لینا جبکہ جان لینا اللہ نے حرام قرار دے رکھا ہے۔

اور اپنے دین و جماعت کو چھوڑنے والا۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہودیوں نے ارتداد کی آزادی کو اسلام کی پٹھیں چھرا گھونپنے کے لیے استعمال کیا وہ اسلام لانے کا اعلان کرتے تھے پھر جلد ہی مرتد ہو جاتے تھے ان کا مقصد یہ دکھانا ہوتا تھا کہ ان میں دینی تعصب نہیں ہے لیکن اسلام میں ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اس میں باقی نہیں رہا جاسکتا۔ گویا سارا معاملہ اسلام سے کھلواڑ کرنے اور اسے رسوا کرنے کا تھا۔

صلح حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مانا تھا کہ جو بھی اسلام کو پسند کرے وہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جاسکتا ہے لیکن ایک شخص نے بھی ایسا نہیں کیا کہ توحید پر شرک کو ترجیح دی ہو۔ بعد میں حضرت عمرؓ کے دور میں ایک قبائلی سردار جبلہ بن ائیم کے باسے میں آتا ہے کہ طواف کعبہ کے دوران اس کی چادر پر کسی عام آدمی کا پیر پڑ گیا تو اس نے اسے چاٹا مار دیا۔ حضرت عمرؓ کے پاس معاملہ گیا تو انھوں نے کہا وہ آدمی نہیں بھی ویسے ہی چاٹا مارے گا۔ جبلہ نے کہا کہ میں سردار ہوں اور وہ ایک عام آدمی ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام نے سب کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ جبلہ رات کو بھاگ کر روم چلا گیا اور وہاں عیسیٰ بن کر پناہ لے لی۔ جبلہ توحید پر ثنیت کو ترجیح نہیں دیتا تھا محض ذاتی اکڑنوں کی وجہ سے ایسا کر بیٹھا تھا اور آخر میں اس پر بہت پھپھاتا بھی تھا۔

آج بھی بہت سی طاقتیں اسلامی وجود کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد کر رہی ہیں اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کو خلط ملط ہونے سے بچائیں اور واضح اور روشن انداز میں اسے سمجھیں۔ غداروں کے خلاف کارروائی ضروری ہے۔

عیسائی بنانے والے بہت سے گروہ اسلام اور اس کے رسول اور کتاب سے نفرت کی بنا پر عقائد و اخلاق کے تعلق سے شبہات اور بے یقینی پیدا کر کے اسلامی معاشرہ کو الٹ پلٹ دینا چاہتے ہیں۔

اس طرح کی کوششوں کی روک تھام ضروری ہے۔

تمام اسلامی سزاؤں کو مانتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کے نفاذ ہی میں معاشرے کی ذہنی و سماجی صحت مضرب ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔

”روئے زمین پر ایک (شرعی) سزا کا نفاذ چالیس روز کی بارش سے زیادہ

بابرکت ہے۔

کیونکہ بارش مردہ زمین ہی کو زندہ کرتی ہے جبکہ شرعی سزائیں مرے ہوئے اخلاق و کردار کو زندہ کرتی ہیں اور قوم میں وبا کے پھیلنے اور اس کے حال و مستقبل کو تباہ ہونے سے بچاتی ہیں۔

قتل اور قصاص

قاتل نے جب جان بوجھ کر کسی کی جان لے لی ہے تو اسے زندگی سے محروم کر دینا ہی انصاف ہے اس پر رحم کھانے کی کوئی گنجائش نہیں۔

مختلف حلقوں سے یہ شور اٹھنے لگا ہے کہ پھانسی کی سزا منسوخ ہو جانی چاہیے کیونکہ مجرم ایک طرح کا مریض ہوتا ہے۔ اس کا علاج کیا جانا چاہیے۔ اس کے قتل سے کوئی فائدہ نہیں مقبول کو زندگی واپس نہیں مل سکتی۔

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکا و یورپ میں اس رائے کو ماننے والے بھی ہو گئے۔ جنہوں نے پھانسی کی سزا منسوخ کر کے اس کی جگہ عمر قید کی سزا بحال کر دی۔ آخر یہ لغو و لیل کے سوا کیا ہے کہ قصاص (یعنی قاتل کو قتل کر دیا جائے) سے مظلوم مقتول کو زندگی واپس نہیں دلانی جا سکتی۔ قاتل کو اس شخص سے قتل کیا ہی کب جاتا ہے؟ اس کو تو سزائے موت اس لیے دی جاتی ہے کہ اس طرح کا جرم کرنے کے بارے میں جو بھی سوچے وہ یقینی طور پر جان لے کہ اسے بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس طرح پورے معاشرے کی زندگی کا تحفظ ہوگا۔

بیشتر مجرم دوسروں کی زندگی پر اس لیے ہاتھ ڈالنے کی جسارت کرتے ہیں کہ انہیں اس کا خیال نہیں ہوتا کہ انہیں اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔ اگر انہیں یہ معلوم رہے کہ کسی کو قتل کرنے کے بعد انہیں بھی لازماً قتل ہونا پڑے گا تو اپنے اقدام سے پہلے سو بار سوچیں گے اور رک جائیں گے۔

قرآن کریم کہتے جامع الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کرتا ہے :

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي
عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے
الآلِبابِ - (البقرة . ۱۷۹)

قصاص میں زندگی ہے۔

یعنی قاتل کو سزائے موت دینے کے نتیجے میں ملک میں امن و امان کا دور
وورہ ہو جائے گا اور جانیں محفوظ ہو جائیں گی۔

قاتل چاہے ذہنی و نفسیاتی مریض ہو یا نہ ہو اسے چھوڑ دینے کا کوئی معقول سبب
نہیں ہے۔

کہتے ہی نفسیاتی و نظریاتی امراض ہیں جو افراد کے طرز سلوک میں نمایاں ہوتے
ہیں۔ متحد و عبادات و ہدایات موجود ہیں جن سے وہ لوگ رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں
جو امن و عافیت چاہتے ہیں اور باعزت زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے کسی کی جان و مال
و آبرو کی طرف ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ کیا کسی ایسے شخص کو معذور قرار دیا جاسکتا ہے
جو شہوت کے غلبہ میں دوسروں کی آبرو پر حملے کرے، یا کسی ایسے شخص کو لوگوں کا خون
بہانے کی چھوٹ دی جاسکتی ہے جو مزاجاً انحراف کا شکار ہو۔ آخر پھر یا گل کتوں اور
خوشخوار بھیڑیوں کو کیوں مارا جاتا ہے؟

قاتل کو بلاشبہ قتل کی سزا ملنی چاہیے اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔

بعض ممالک میں حکم الہی کو نظر انداز کرنے اور شیطانی حکم کو سر بلند کرنے کے لیے
مخاتلوں کو چھوڑ دیا گیا۔ پھر اس کا کیا نتیجہ بھگتنا پڑا؟ جرم عام ہو گیا، انتشار پھیل گیا
لوگ سڑکوں پر نکلتے ہوئے ڈرنے لگے کہ کہیں گولیوں کا شکار نہ ہو جائیں اور گھروں
میں ہر دم خوف مسلط رہنے لگا کہ مجرم نہ گھس آئیں۔

کیا مجرمین پر رحم کھانے اور انہیں نفسیاتی مریض بتانے کا یہی مقصد تھا؟
اللہ تعالیٰ کسی ایک انسان کی زندگی پر حملہ تمام انسانوں کے حق زندگی پر حملہ قرار

دیتا ہے۔

اِنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ تَحْسِيْنٍ اَوْ
جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین

فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَانَمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَانَمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا۔

۲۲۵ میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

(الاحقافہ - ۳۲)

زندہ رکھنا کبھی کسی ڈوبتے ہوئے کو بچا کر بھی ہوتا ہے، کسی مظلوم شخص کو ظالموں کے پنجوں سے چھڑا کر بھی ہوتا ہے اور کبھی کسی قاتل سے قصاص لے کر پورے معاشرے کے حق زندگی کو مضبوط و مستحکم کر کے بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک قاتل کو سزائے موت دینا بہت سوں کی زندگی کے تحفظ کا سبب بن جاتا ہے جو خونخوار قاتل کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کا شکار ہو سکتے تھے۔ قصاص قدیم قانونِ فطرت ہے۔

وَكَبْتَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصًا فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ۔

ہم نے توراہ میں یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔

(المائدہ - ۴۵)

یہاں صدقہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے شرعی حق سے دستبردار ہو جائے مقبول کے وارثوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مال کی کوئی مقدار لے کر قاتل کو چھوڑ دیں یا پھر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے معاف کر دیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت ہی بڑھاتا ہے۔ یہاں قاتل کو سزائے موت سے بچایا جاسکتا ہے لیکن ریاست کا یہ حق باقی رہتا ہے کہ وہ امن کو برباد کرنے والوں کی مناسب سزا میں سے۔

کوئی شخص سوال کر سکتا ہے کہ وارثوں کے معاف کر دینے سے قصاص کیوں ساقط ہو جاتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ جرائم کے پس منظر سے بہت سی چیزیں متعلق ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو مادی نقصان اتنی تکلیف نہیں پہنچاتا جتنا معنوی ذلت تکلیف پہنچاتی ہے۔ اگر کوئی طاقتور سے مار دے تو اسے بدن کی تکلیف سے اتنا رنج نہیں ہوتا جتنا اپنی بے بسی اور کمزوری کے احساس سے ہوتا ہے۔ جب اسے دشمن کی زندگی اور موت کا حق دے دیا جائے اور لوگ اس سے معافی مانگنے آئیں اور اسے عملاً بالادست تسلیم کر لیں تو اس سے اسے تسلی و تسفی ہو جاتی ہے۔

پھر بھی انفرادی حق سے دستبرداری معاشرے کے حق کو ختم نہیں کرتی۔

تعزیرات

معاشرے میں امن و امان کا بول بالا کرنے اور انتشار و ظلم کے رجحانات کی روک تھام کے لیے ریاست کو مختلف قسم کی سزائیں مقرر کرنے کا حق ہے۔ کچھ جرائم ایسے ہیں شریعت نے جن کی کسی دنیاوی سزا کا ذکر نہیں کیا ہے مثلاً سوڈن میں میدان جنگ سے فرار، دواؤں اور دیگر اشیاء میں ملاوٹ وغیرہ وغیرہ۔ ان جرائم کے استیصال کے لیے عدالت مناسب سزائے سکتی ہے، جیل میں ڈال کر کوڑے لگا کر، مالی جرمانے عائد کر کے اور جاسوسی اور وطن سے غداری کی صورتوں میں سزائے موت تک دے کر۔

ساری دنیا جرائم پر سزا دینے کے اصول کو تسلیم کرتی ہے البتہ کتنی اور کیسی سزا دی جائے اس میں حالات کے مطابق فرق ہو سکتا ہے۔

تعزیرات کی حد میں وہ جرائم بھی آجاتے ہیں جو شرعی حدود کی حد تک نہ پہنچے ہوں مثلاً مقررہ مقدار سے کم یا غیر محفوظ چیز کی چوری یا مثلاً اہمیت طرازی کی حد تک پہنچے بغیر دشنام طرازی۔

اہمیت اس بات کی ہے کہ سزائیں انصاف کے اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔ سختی یا نرمی میں ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائیں۔ ان سزاؤں کی تعین قانون، تربیت اور سماجی اصلاح کے میدانوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین کے اداروں کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ البتہ قاضی (جج) کو زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم سزا دینے کا اختیار ہونا چاہیے۔

قاضی کو یہ بات بھی ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ صرف جرم ہی پر سزا دی جاسکتی ہے جو حاکم کسی محکوم کو بلاگناہ زد و کوب کراتا یا اس پر ظلم کرتا ہے تو اس کا مواخذہ ہونا چاہیے چاہے وہ جتنے بڑے منصب پر فائز ہو۔ منصب ظلم کرنے کا ذریعہ نہیں ہے اور اسلام اس کے انتظار میں نہیں رہتا کہ کتنی جلدی کوئی غلط کار ملے اور اس پر سزا نافذ کر دے۔

دین تو خطا کاروں کی ستر پوشی اور ان کے ساتھ نرمی برتنے پر زور دیتا ہے۔ ہاں اگر مجرم بار بار جرم کرتا ہے تو یہ معاشرے کے ساتھ بددیانتی اور انصاف کی خلاف ورزی ہوگی کہ اسے جرم کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔

فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ حدود کا نفاذ اس مجرم پر ہونا چاہیے جو نہ اس کی پرواہ کرتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور نہ برائی کرنے سے ڈر محسوس کرتا ہے۔

کبھی جن پر حد قائم کی جاتی ہے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ عادی مجرم نہیں ہیں بلکہ ان سے ایک بار غلطی ہو گئی ہے اور اسے معاف کر دیا جانا چاہیے۔ لیکن سمجھدار قاضی اس سے دھوکا نہیں کھاتے۔

ابن حزم اس عنوان کے تحت کہ ”خدا کسی بندے کو پہلے گناہ پر نہیں پکڑتا“ روایت کرتے ہیں:

”حضرت ابو بکرؓ کے پاس ایک چور لایا گیا۔ انہوں نے فیصلہ دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔“

چور نے کہا: اے خلیفہ رسولؐ مجھے معاف کر دیجئے میں نے اس سے پہلے کبھی چوری نہیں کی۔

حضرت ابو بکرؓ نے کہا: تم جھوٹے ہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اللہ تعالیٰ پہلے گناہ پر کسی مومن کو نہیں پکڑ لیتا۔“

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:

حضرت عمرؓ کے پاس ایک چور لایا گیا۔ وہ کہنے لگا خدا کی قسم میں نے اس سے پہلے

کبھی چوری نہیں کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، عمر کے پروردگار کی قسم تم جھوٹے ہو۔ اللہ تعالیٰ پہلے گناہ پر کسی بندے کو نہیں پکڑتا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا: اللہ اس سے زیادہ نحل والا ہے کہ وہ پہلے ہی گناہ پر اپنے بندے کو پکڑے۔

تب حضرت عمرؓ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ ہاتھ کاٹنے کے بعد حضرت علیؓ نے اس کے پاس جا کر کہا: میں تمہیں خدا کی قسم دلاتا ہوں تم نے کتنی بار چوری کی۔ اس نے کہا: اکیس مرتبہ۔



ان خلفاء کو حد جاری کرتے وقت یہ یقین تھا کہ کسی شخص کا جرم طہیت ازبام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عادی مجرم بن چکا ہے۔

اب اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ مجرم عادی نہیں بلکہ اس سے غلطی ہو گئی تو کیا اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ: ”اپنے درمیان حدود کو معاف کر لیا کرو۔ جو حد مجھ تک پہنچ جائے گی وہ واجب ہو جائے گی۔“

ابن حزم کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کا حال لوگوں سے پوشیدہ ہو اور اس سے پہلی بار غلطی ہو جائے تو اسے معاف کر دیا جائے گا لیکن جو جرم کو تکلیف دہ حد تک ظاہر کرے اس کا معاملہ قاضی کے پاس لے جایا جائے گا۔

ظاہر ہے شرعی حدود کے نفاذ کے لیے ثبوت کی فراہمی دشوار ہے اور ایک عام آدمی کے بارے میں تو بہت کم ثبوت فراہم ہو سکتا ہے۔

پتھر میں تو وہی آئے گا جو چیلنج کر کے جرم کرے اور پاگل پن میں اتنا اندھا ہو چکا ہو کہ کسی طرح کی احتیاط نہ کرے۔

اور اس طرح کے کسی شخص کے حال پر انوس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ معاشرے کا حق

ہے کہ اس کی سزا سے راحت حاصل کرے۔

حاکم (قاضی) کو چاہیے کہ جو لوگ پکڑے میں آئیں ان کے حالات کو دیکھے اگر ان لوگوں سے معاشرے کو نقصان پہنچ رہا ہو تو ان پر حد جاری کرے اور اگر وہ طبعاً نیک ہوں اور صبح تو بر کر چکے ہیں تو چھوڑ دے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا توبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے؟
حق بات یہ ہے کہ امام کو اس کا اختیار ہے کہ وہ حد جاری کرے یا ساقط کرے
لیکن پہلے پکڑے جانے والوں کے حالات خود جرم کے پس منظر اور ان کے ایمان و توبہ
کی نوعیت کا جائزہ لے لے۔ امام ابن تیمیہ کی یہی رائے ہے۔

امام ابو محمد کہتے ہیں کہ توبہ سے تمام حدود ساقط ہو جاتے ہیں۔ امام شافعی کا پہلا
قول بھی یہی ہے جو ابو عبد الرحمن اشعری نے نقل کیا ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ روایت ہے کہ:
حضرت ماعز بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ
مجھ پر حد جاری کیجیے۔ آپ نے چار مرتبہ درگزر سے کام لیا پھر سنگسار (رحم) کرنے کا حکم
دیا۔ جب حضرت ماعز کو پتھر لگنے لگے تو انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پھر
ایک ضرب کھا کر گر پڑے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ
نے فرمایا ”تم لوگوں نے انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیا شاید اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لیتا۔ اگر
تم انہیں اپنے کپڑے سے ڈھانک لیتے تو تمہارے لیے بہتر ہوتا۔“

حضرت علقمہ بن وائل کی ایک روایت میں ہے کہ:

”صبح منہ اندھیرے جب ایک عورت مسجد جا رہی تھی تو ایک آدمی زبردستی اسے
دبوچ بیٹھا۔ عورت نے وہاں سے گزرنے والے مرد کو مدد کے لیے آواز دی (وہ دورے
مگر) اتنے میں مجرم بھاگ گیا۔ اسی دوران کچھ اور لوگ گزرے تو عورت نے مدد کے لیے
پکارا انہوں نے اس شخص کو جا پکڑا جسے عورت نے پہلے مدد کے لیے آواز دی تھی (مجرم
ہاتھ نہیں لگا)

لوگ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ عورت نے کہا

کہ وہی شخص اس کا مجرم ہے (اندھیرے میں اصل مجرم کو پہچان نہیں سکی تھی) لوگوں نے بھی یہی بتایا کہ انہوں نے اسے بھاگتے ہوئے پکڑا تھا۔

جو شخص پکڑا گیا تھا اس نے کہا کہ میں تو عورت کی مدد کر کے اس کے مجرم کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اتنے میں ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔
عورت نے کہا کہ وہ جھوٹا ہے اسی نے حرکت کی تھی۔

آپ نے فرمایا: لے جاؤ اسے سنگسار کر دو۔

تب ایک شخص لوگوں کے درمیان سے اٹھا اور بولا: اسے سنگسار نہ کرو مجھے کرو کہ میں نے ہی اس کے ساتھ وہ جرم کیا تھا (اس نے اعتراف کر لیا)

تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اے عورت) تجھے تو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، اور جس نے (پہلے) مدد کی تھی اس کے لیے اچھے کلمات ارشاد فرمائے۔

حضرت عمر نے عرض کیا: جس نے زنا کا اعتراف کیا ہے اسے رجم کر دیا جائے۔

آپ نے فرمایا: نہیں: اس نے اللہ سے توبہ کر لی۔

حضرت وانلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ:

میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا۔ ایک آدمی آیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ مجھ سے ایک جرم سرزد ہو گیا ہے مجھ پر حد جاری فرمادیجئے۔ آپ نے اعراض فرمایا۔

وہ دوسری بار آیا تب بھی آپ نے اعراض فرمایا۔

اس نے تیسری بار بھی آکر وہی عرض کیا تب بھی آپ نے اعراض فرمایا۔

پھر نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ چوتھی بار آکر پھر وہی عرض کرنے لگا۔

آپ نے فرمایا: کیا تم نے اچھی طرح وضو کر کے ابھی نماز نہیں پڑھی؟ جاؤ یہی تمہارا

کفارہ ہو گیا۔

حضرت انس کی ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس آیا اور عرض کیا کہ مجھ سے زنا کا گناہ سرزد ہو گیا ہے مجھ پر حد جاری کر دیجئے، پھر

نماز کھڑی ہو گئی، اس نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا: تمہاری نماز تمہارے لیے کفارہ بن گئی۔

امام ابو محمد کہتے ہیں کہ اس آیت سے:

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا
أَوْ يَصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأرجُلُهُمْ
مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ
ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ إِلَّا الَّذِينَ
تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمُدِّرُوا عَلَيْهِمْ
فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ

جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے ہیں
اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں، ان کی سزا
یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے، یا انہیں سولی پر
چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف
جانب سے کاٹے جائیں یا اس جگہ سے دور
بھگا دیے جائیں۔ یہ ان کی رسوائی ہے دنیا میں
اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے سوائے
ان کے جنہوں نے تمہارے قابو پانے سے پہلے توبہ

(المائدہ - ۳۳ - ۳۴)

کر لی تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

لوگوں نے یہ استنباط کیا ہے کہ نص قرآن سے بھی یہ ثابت ہے اور اجماع سے بھی کہ پکڑے
جانے سے پہلے توبہ سے رہزنی کی حد ساقط ہو جاتی ہے۔ اس لیے پکڑے جانے سے پہلے
توبہ سے زنا، چوری، نہمت طرازی اور شراب نوشی وغیرہ سے متعلق تمام حدیں ساقط ہو جائیں گی۔

ابن حزم دیگر حدوں کو رہزنی کی حد پر قیاس نہیں کرتے کیونکہ وہ قیاس ہی کو نہیں
مانتے ان کا کہنا ہے کہ توبہ سے حد و ساقط نہیں ہوتیں۔

فقہاء کے نقطہ ہائے نظر کا جائزہ لینے کے بعد یہی بات دل کو لگتی ہے کہ قاضی مجرم
کے حالات اور جرم کے پس منظر کو دیکھ کر ہی حد جاری کرنے کا فیصلہ کرے گا ورنہ دوسری
سزائیں دے گا یا توبہ کرنے والے کو معاف کر دے گا۔

اسلامی شریعت

اسلامی شریعت

شریعت کا اطلاق خاص طور پر اسلام کے اس حصہ پر ہوتا ہے جو فقہ و قانون کی بحثوں سے متعلق ہے جبکہ شریعت کے عام مفہوم میں تمام اسلامی تعلیمات شامل ہیں۔
قرآن کریم میں تشریح کے الفاظ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات جیسے تمام دینی احکام و ہدایات کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ
نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا
بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ
وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ۔
(الشوریٰ - ۱۳)

تمہارے لیے دین میں وہی راہ ڈالی جس کا
حکم نوح کو دیا تھا۔ اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری
طرف اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو
اور عیسیٰ کو کیا، یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں
اختلاف نہ ڈالو۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأُمْرِ
فَاتَّبِعْهَا۔ (الجاثیة - ۱۸)

پھر ہم نے تجھ کو دین کے کام کے ایک راستہ پر
رکھا سو اسی پر چل۔

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ مِمَّا جَاءَكَ مِنَ
الْحَقِّ بِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شَرِيعَةً
وَمِنْهَا جَاءَ، وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ
أُمَّةً وَاحِدَةً۔ (المائدة - ۴۸)

اور تیرے پاس جو سیدھا راستہ آیا اسے چھوڑ کر
ان کی خوشی پر مت چل۔ ہم نے تم میں سے
ہر ایک کو ایک دستور اور راہ دی ہے اور اللہ
چاہتا تو تمہیں ایک دین پر کر دیتا۔

آج کل ہر شعبہ میں تخصص کا لحاظ کیا جاتا ہے مثلاً عقیدہ کا مطالعہ فقہ اور حقوق و معاملات
وغیرہ سے الگ شعبہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے اور فقہ اور حقوق و معاملات کو اصطلاحاً
"اسلامی شریعت" کا نام دیا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔

شریعت کے ماخذ

ہم قطعی طور پر یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ وحی الہی کا سلسلہ قرآن کریم پر مکمل ہو گیا جو کچھ قرآن کریم میں ہے وہ بغیر کسی تحریف کے آسمانی پیغام ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے جو کچھ چاہتا ہے اسے ہمیشہ کے لیے اس کتاب میں محفوظ کر چکا ہے اب کسی اور کو اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ کسی اور کتاب کے بارے میں ایسا نہیں کہا جاسکتا۔

آج پوری دنیا میں اپنے بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا جو واحد کلام پایا جاتا ہے وہ قرآن کریم ہی میں مذکور ہے۔

اور قرآن کریم ان سارے حقائق کا جامع ہے جن کی طرف حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور ان سے پہلے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم وغیرہ انبیائے کرام نے دعوت دی تھی، اگر ان حضرات میں سے آج کوئی زندہ کیا جاتا اور اس آخری وحی کے آئینے میں اپنے پیغام کو صاف شفاف شکل میں دیکھتا تو سب سے پہلے اسے ماننا اور اسے ماننے کی دعوت دیتا۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ کسی شخص کے پاس جو بھی خط آتا ہے وہ اسے پڑھتا ہے اور جو کچھ اس میں لکھا ہوتا ہے اسے سمجھتا ہے پھر ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا خط ہی ہو سکتا ہے۔

لیکن مسلمانوں نے کتاب الہی کی تعظیم صحیح ڈھنگ سے نہیں کی۔ انہوں نے اپنے

جذبات کا محور اس کے مقاصد پر غور و خوض سے زیادہ اس کتاب کے حروف کی تقدیس اور تجوید کو بنالیا۔

نہ اس طرح قرآن کی خدمت ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے پیغام کا بول بالا ہو سکتا ہے۔
میں قرأت کی مجلسوں میں لوگوں کی آہ و بکا سنتا ہوں تو دہشت زدہ رہ جاتا ہوں
عوام کا رویہ تو یہ ہے اور خواص کا طرز عمل بھی قابل تنقید ہے۔

اور وہ یوں کہ قرآن نہیں پران کی توجہ محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی قرآن کریم کی خدمت میں علماء کی کوتاہی پر بحث کرتے ہوئے
لکھتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے کہ اس پہلو سے ہمارے علماء نے قرآن کی خدمت میں کوتاہی برتی ہے۔
انہوں نے علوم قرآن یعنی اس کے عقائد، اس کی فقہ، اخلاق اور سیاست وغیرہ پر کافی کتابیں
نہیں لکھیں بلکہ ایک طرح سے اسے نظر انداز کیا اور اس کے مصداق بنے۔

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي
اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا
اور رسول کہے گا اے میرے رب میری قوم کے
لوگوں نے اس قرآن کو متروک اور نشانہ تضحیک
بنالیا تھا۔ (الفرقان - ۳۰)

جبکہ صحابہ کرامؓ رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہر چیز پر قرآن ہی کو ترجیح دیتے تھے۔
چونکہ صحابہ کرام کا دور تدوین و تالیف کا دور نہیں تھا اس لیے انہوں نے کتابیں
نہیں مرتب کیں یہ ذمے داری ان کے بعد آنے والوں کی تھی لیکن وہ اس کی ادائیگی سے
غافل رہ گئے اور اشخاص کی رایوں، اسرائیلی حکایتوں اور اختلافی مسائل میں مشغول ہو گئے۔
قرآن کریم کی ترتیب چونکہ ابواب پر نہیں ہے اس لیے بہت سے لوگ اس کے
اپنی مطلوبہ معلومات حتیٰ کہ مخصوص مسائل تک نکالنے میں دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔

جن علماء نے احکام قرآن کے موضوع پر کتابیں لکھیں انہوں نے بھی تفسیروں کی
ترتیب کا لحاظ رکھا ابواب کے طرز پر مرتب نہیں کیا۔ اور چونکہ حدیث، فقہ اور فتاویٰ
وغیرہ ابواب کے طرز پر مرتب ہوئے اس لیے لوگوں کو ان سے فائدہ اٹھانا آسان لگا
اور وہ قرآن پر غور و خوض اور ہر چیز سے پہلے اسی کی طرف رجوع اور اس سے استنباط

سے دور ہو گئے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے علماء قرآن پر ابواب کے مطابق آسان اسلوب میں جامع کتابیں لکھیں، آیات اور ثنابت شدہ حدیثوں کے درمیان تطبیق کو نمایاں انداز میں پیش کریں اور موجودہ زمانہ کے لوگوں کے لیے انھیں سمجھنا آسان بنائیں۔ اس طرح وہ دین کی زبردست خدمت کریں گے اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے اور نوجوانوں کو الحاد اور دین سے برکشتگی سے بچانے کا ذریعہ بنیں گے۔

سنت قرآن ہی سے ماخوذ ہے

بہت سے محقق علماء کی رائے کے مطابق ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ صحیح احادیث میں جو احکام ملتے ہیں وہ قرآن کریم سے ماخوذ ہیں اور اس کا استنباط خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الہی ہدایت و تائید سے فرمایا۔ اس لیے ہمارے لیے انہیں ماننا اور ان پر عمل کرنا واجب ہے بشرطیکہ وہ احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس فہم و استنباط کو بھی ”نبیین“ اور بھی ”ارارۃ“ کا نام دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ
مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ
يَتَفَكَّرُونَ

اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے تاکہ لوگ خود بھی غور و فکر کریں۔

(النحل - ۲۴)

اے نبی ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ
لِتُحْكَمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا آرَأَى
اللَّهُ

(النساء - ۱۰۵)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سنت قرآن کے بعد دین کا دوسرا ماخذ و سرچشمہ ہے اور جو متواتر منقول ہو اس پر حکم قرآن کی طرح عمل کرنا واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایت صحیح طور پر منقول ہے اسے ہم لازماً

قبول کریں گے اور حکم و استدلال میں اسے وہی مقام دیں گے جس کی وہ حقدار ہے۔
 قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا اولین ستون ہے۔ اس کی آیات
 آپ کے دل میں جاگزیں ہوئیں، آپ کے افکار و احساسات میں ان کے معانی و مقاصد
 جلوہ گر ہوئے اور آپ کا باطن وحی کی شاعیوں سے منور ہوا۔ اس لیے آپ سے اسی قول و
 عمل کا صدور ہو سکتا تھا جو قرآن اور اس کی ہدایات کے مطابق ہو۔

دینی امور میں رسول کریم کی بات اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست وحی نہ ہو
 تو بھی ان قرآنی حقائق کی پیداوار ہے جو آپ پر وحی کیے گئے اور جو آپ کے دل و دماغ میں
 رچ بس گئے اور پھر دوسروں کی رہنمائی کے لیے اسی سرچشمے سے نکلی۔

یہ سادہ لوحی ہوگی کہ نبوت کو محض ملا بر اعلیٰ کی خبروں کی تکرار سمجھا جائے اور رسول کو
 ایسا شخص مانا جائے جو نہ بات کرتا تھا نہ حکم و فتویٰ و نصیحت صادر کرتا تھا سوائے اس صورت
 میں جب فرشتہ آپ کے کانوں میں سرگوشی کر کے بتائے کہ کیا کہنا اور کیا کرنا ہے۔

رسالت اس سے زیادہ اہم چیز کا نام ہے۔

رسول کریم کے دل و ضمیر میں جب قرآن کریم رچ بس گیا اور آپ کی روح قرآنی
 ہدایت اور بھلائی سے معمور ہو گئی تو آپ قرآن کی تفسیر بھی کرنے لگے اور حکمت کی بات بھی
 بولنے لگے۔ اور اس سلسلے میں قول و عمل، اثبات و جواب کی صورت میں ہزاروں کلمات
 سے قرآن کریم کی تشریح فرمائی۔

اس پورے معاملے میں سیرت نبوی تمام تر حقیقی ہو سکتی تھی کیونکہ یا تو شروع ہی میں
 حق آپ پر الہام ہو جاتا تھا یا پھر اگر کسی معاملے میں آپ اجتہاد فرماتے تھے اور غلطی ہو جاتی
 تھی تو وحی الہی آپ کو غلطی پر برقرار نہیں رہنے دیتی تھی۔ اس لیے اس کا کوئی امکان ہی
 نہیں ہو سکتا کہ سنت میں کوئی چیز قرآن کے مخالف ہو۔

اب اگر کسی حدیث کے مفہوم میں تضاد نظر آئے تو یا تو وہ روایت ہی صحیح نہیں ہوگی
 یا اس کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی ہوگی۔

افسوس یہ ہے کہ بہت سے مسلمان مذکورہ باتوں کی روشنی میں سنت کو اچھی طرح سمجھنے

کی کوشش نہیں کرتے اور نہ سلف صالح کے طریق کار کی پیروی کرتے ہیں۔
 آپ دیکھیں گے کہ ان میں بہت سے لوگ — قرآن کریم سے غفلت کی وجہ سے
 اپنی زبانوں پر ایسی روایات لے آتے ہیں جو — اگر قرآن کریم سے دل و دماغ کا تعلق
 مضبوط رکھتے تو — کبھی ذکر بھی نہ کرتے۔

مثلاً عوام میں مشہور شبِ برأت کی بات لیجیے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَارَكَةٍ ہم نے اسے ایک مبارک رات میں نازل کیا۔

(الدخان - ۳)

مراد یہی شبِ برأت (پندرہویں شعبان کی رات) ہے پھر اس آیت کا:

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ یہ وہ رات ہے جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ

ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ (الدخان - ۴)

کے حوالے سے عکرمہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس رات میں سال بھر کے معاملات طے ہوتے
 ہیں اور موت و حیات وغیرہ لکھ دی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں بہت سی روایات بھی نقل کی جاتی ہیں۔

جبکہ صحیح بات جس کی تائید قرآن کرتا ہے وہ یہ ہے کہ مبارک رات سے مراد شبِ قدر

ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ مبارک رات سے مراد شبِ قدر ہی ہے جو پندرہویں شعبان کی رات

کہے وہ دلیل سے دور ہے نصِ قرآنی سے یہ ثابت ہے کہ وہ رات رمضان میں ہے۔

جب قرآن کریم سے صراحتہً ایسا ثابت ہے تو پھر کس طرح لوگ ایسی روایات نقل

کرتے ہیں جو اس کے خلاف ہوں۔ آخر اس طرح کی حدیثوں کو کیسے رائج ہونے دیا جاتا ہے؟

دنیا کے ساتھ مومن کے تعلق، عورت کے ساتھ مرد کے تعلق اور کافر کے ساتھ مسلمان

کے تعلق وغیرہ جیسے اہم معاملات میں بھی بہت سی ایسی ہی روایات خیل ہو گئی ہیں۔

آخر طبرانی کی اس روایت سے ملت کو سوائے معنوی و مادی بربادی کے کیا حاصل ہو سکتا

ہے کہ:

”مجھے دنیا کی بربادی کے لیے مبعوث کیا گیا ہے اس کی آباد کاری کے لیے نہیں“
 دنیا کے ساتھ مومن کا تعلق اس ہلک محو پر قائم نہیں ہو سکتا۔
 جس شخص نے قرآن کو سمجھا ہو اور یہ آیت پڑھی ہو کہ:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا
 لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ط
 ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ
 بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامانِ زینت
 فراہم کیا۔ (الاعراف - ۱۰)

وہ کیسے یہ مان سکتا ہے کہ دنیا کی بربادی ہی مقصد ہے۔
 اس طرح کی باتوں کے ارد گرد، زندگی کی جدوجہد اور دنیا کی آباد کاری سے فرار اختیار
 کرنے والے اور ایمان کے معاملات میں لاطائل بحثوں میں پڑنے والے سیکار لوگ جمع
 ہو جاتے ہیں۔ ○

عورتوں کے ساتھ مردوں کے تعلقات کے سلسلے میں بہت سے غلط احکام مشہور
 ہو گئے ہیں اور بہت سے صحیح احکام نظر انداز ہو گئے ہیں۔

پرفے کے سلسلے میں نقاب کو اتنی زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے کہ اسے عین دین
 بنا دیا گیا حتیٰ کہ قریبی رشتہ داروں تک کو عورت کی زینت دیکھنے کی اجازت نہیں۔ اس
 سلسلے میں ابن جریر طبری حضرت عائشہؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ”میں اپنی زینت کے ساتھ
 اپنے بھتیجے عبد اللہ بن طفیل کے سامنے آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند نہیں فرمایا۔
 میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ میرا بھتیجا ہے۔

آپ نے فرمایا: بالغ ہونے کے بعد عورت کے لیے جائز نہیں کہ اس کا کوئی حصہ ظاہر
 ہو سوائے اس کے چہرے کے اور (آپ نے اپنے ہاتھ کے گٹے کو پکڑ کر بتایا) ہتھیلی کے“

مشہور محدث علامہ ناصر الدین البانی اس حدیث کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار
 دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عورت کے اپنے بھتیجوں کے سامنے اپنی زینت ظاہر کرنے کی اجازت
 نص قرآنی سے ثابت ہے۔ اس لیے یہ حدیث باطل ہے۔

اگر ہم شروع ہی سے قرآنی ہدایات کو پیش نظر رکھتے تو حدیث کی سند پر بحث کی ضرورت

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ اور ہم نے تمہیں جہان کے لوگوں کے لیے رحمت
(الانبیاء۔ ۱۰۷) بنا کر ہی بھیجا ہے۔

مذکورہ حدیث اگر صحیح بھی ہو تو اس کے پس منظر اور مناسبت کے ساتھ بیان کی جان
چاہیے۔ اور کتاب الہی اور سیرت رسول کو پوری طرح سمجھ کر۔

اس حدیث سے ایسا حکم نکلتا ہے جس کا قائل ایک بھی فقیہ نہیں۔
توحید کو جہاد کا مقصد بتانا تاکہ لوگوں کے اسلام قبول کرنے تک جنگ نہ تھے۔
ایک باطل مفہوم و حکم ہے جس کا اسلامی شریعت میں کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ اہل کتاب کے
ساتھ معاملہ میں یہ صریح نص قرآنی کے بھی خلاف ہے۔ جارحیت کرنے والوں نے جتنی
بھی اذیت رسانی اور شدت پسندی سے کام لیا ہو ان کی شکست اور کچھ مالی جرمانے کے بعد
انہیں ان کے عقیقہ پر چھوڑ دیا جائے گا اور بس۔

جزیرۃ العرب کے بت پرستوں کے ساتھ پیش برس تک اسی اصول کے مطابق
عمل ہوتا رہا کہ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔ بلکہ انہیں اسلام
سے پھر جانے کا حق بھی دیا گیا۔ اگر اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں پسند نہ آیا ہو۔
پھر جب اس نرمی نے ان کی خونخواری میں اور شدت ہی پیدا کی اور یہ ظاہر ہو گیا
کہ وہ اسلام کے ساتھ غداری کے لیے صرف موقع ڈھونڈ رہے ہیں تب سورہ برأت
نازل ہوئی اور توبہ نہ کرنے والوں کی گردن پر تلوار رکھنے کی بات کہی گئی۔ پھر یہ اجازت
بھی چند مہینوں کی محدود مدت کے لیے تھی۔

جو حدیث بھی قرآن کے نص اور روح کے خلاف ہو وہ خود بخود باطل ہو جاتی ہے۔
دلیل قطعی جب دلیل قطعی سے ٹکرائے تو وہ ساقط ہی ہوگی۔

مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حضرت کعبؓ اجار سے ایک روایت منقول ہے
جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور اس کی بہت سی چیزوں کو سات دنوں
میں تخلیق فرمایا، جبکہ قرآن کریم میں صاف آیا ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور ان
کے درمیان کی چیزوں کو چھ دنوں میں تخلیق فرمایا۔

ظاہر ہے یہ حضرت کعب بن جابر کا قول ہو سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
 نہیں کیونکہ آپ کا قول تو قرآنی آیات کی شرح و تفسیر کرتا ہے نہ کہ ان کی مخالفت۔
 علمائے حدیث نے اسی بنیاد پر اس حدیث کو صحیح نہیں تسلیم کیا۔
 بہر حال سنت دین کا دوسرا ماخذ ہے۔ البتہ اس کی سند اور متن کو اچھی طرح
 پہچانتے والوں کی ضرورت ہے جو سنت سے پہلے _____ اور بعد میں بھی _____
 قرآن کریم کے معانی و مقاصد کو پہچانیں۔

اجتہاد

جو شخص وحی کے ماحول میں رہتا ہو، اس کی حکمت اور احکام کا ماہر ہو، اس کی تلاوت اور اس پر غور و خوض میں منہمک رہتا ہو، اس کے بیاق و سباق اور مقاصد کی بصیرت رکھتا ہو۔ پھر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے گہری واقفیت رکھتا ہو، آپ کے تقویٰ و عبادت، اخلاق و کردار اور اقوال و افعال سے اتنا زیادہ آگاہ ہو کہ آپ کی سنت کو مذکورہ چیزوں سے مستنبط کر سکے۔

ایسا شخص پاکیزہ و متقی دل اور طاقتور بصیرت کے ساتھ زندگی کے حالات کو سمجھ کر انھیں دین کے رنگ میں رنگنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ وہ کتاب و سنت کے علم کے مطابق اسلامی مقاصد کے ساتھ انھیں ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرے گا اور اسی سانچے میں انھیں ڈھالنے کا خواہاں ہوگا۔

تغیر پذیر امور کو شریعت کے اصولوں اور طریقوں کے مطابق تطبیق دینے کا نام ہی اجتہاد یا قیاس ہے، اور یہ شریعت کے اصولوں اور دلیلوں میں ہے جس سے احکام جانے جلتے ہیں۔

جب تک نئے نئے حالات اور واقعات پیش آتے رہیں گے امت اس راستے پر چلتی رہے گی۔

البتہ یہ بڑا کام ہر انسان کے بس کا نہیں، عوام کا مزاج نہ اس کی صلاحیت رکھتا ہے نہ ان کی بات مانی ہی جاسکتی ہے اسی لیے فقہ کا وجود رونما ہوا۔

نامعلوم احکام کو معلوم احکام سے مطابقت دینا مطالعہ و استدراود چاہتا ہے جس میں

یہ صلاحیت پائی جائے اسے اس کا اہل قرار دیا جائے گا ورنہ نہیں۔
قاہرہ یونیورسٹی میں اسلامی شریعت کے سابق استاد پروفیسر علی حسب اللہ لکھتے ہیں:
”امت کے لیے (قانون کا) تیسرا ماخذ اجتہاد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ
أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ
تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ
الرَّسُولُ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النساء - ۵۹)

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ اور رسول کا اور
تم میں سے جو حاکم ہوں ان کا۔ پھر اگر کسی چیز
میں جھگڑہ پڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف
لوٹاؤ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین
رکھتے ہو۔

اور جب ان کے پاس اس کی یاد رکھی کوئی چیز
پہنچتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اگر اس
کو رسول تک اور اپنے حاکموں تک پہنچا دیتے
تو جوان میں تحقیق کرنے والے ہیں اس کو تحقیق
کرتے۔ (النساء - ۸۳)

گویا کتاب و سنت کے بعد اجتہاد سے بھی احکام متنبط کیے جاتے ہیں۔ اس کی تائید
حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ:

”جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سین بھیجا تو فرمایا،

اگر کوئی معاملہ درپیش ہوا تو کیا کرو گے؟

عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو؟

عرض کیا: تب سنت رسول کے مطابق۔

فرمایا: اور اگر سنت رسول میں بھی نہ ہو تو؟

عرض کیا: تب اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔

تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہوا کر فرمایا:

”اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے ایلچی کو اس بات کی توفیق بخشی جو اس کے رسول کو پسند ہے۔“

حضرت سعید بن مسیب حضرت علیؑ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کے بارے میں نہ قرآن کریم میں کوئی آیت نازل ہوئی ہو اور نہ آپؐ کی کوئی سنت ہو؟ آپؐ نے فرمایا: مومنین میں سے اہل علم کو اکٹھا کرو اور باہم مشورہ سے معاملہ طے کرو۔ ایک آدمی کی رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں۔ جن معاملات میں ایک فرد کے اجتہاد سے حکم معلوم ہونا کافی ہو ان میں انفرادی اجتہاد، جیسا کہ حضرت معاذؓ کی روایت میں ہے۔ اور جن معاملات میں وسیع پیمانے پر تبادلہ خیال کی ضرورت ہو ان میں علمائے امت کا (مشترکہ) اجتہاد جیسا کہ حضرت علیؑ کی روایت میں ہے۔

اجماع

شریعت میں کچھ حقائق مسلمہ ہیں ان کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے میں صدیوں کے دوران کبھی اختلاف رائے نہیں ہوا۔ ان میں زیادتی یا کمی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان مسلمہ حقائق کے بارے میں اختلاف و شک پیدا کرنے کی کوشش زبردست فتنہ اور برائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

یہی اجماع کا مفہوم اور اجماع کی مخالفت میں مضمربرائی کا راز ہے۔ جن معاملات میں صریح کتب نہیں ہے اور عقلاً ان کے تعلق سے متعدد صورتیں ممکن نظر آتی ہیں لیکن مسلمان کسی ایک بات یا عمل پر اتفاق رائے کر چکے ہیں تو پھر اس کی مخالفت اسلام اور امت کی مخالفت قرار پائے گی۔

مثلاً نماز کو لیجیے۔

فرض نمازیں پانچ ہیں اور ان کی رکعتیں مجموعی طور پر سترہ ہیں۔ ان کی ادائیگی کا طریقہ اور ہیئت بھی سب کو معلوم ہے۔

اب ان مسلمہ باتوں میں اختلاف رائے کرنا اجماع کی مخالفت اور کفر کی طرف

لے جانے والا ہوگا۔

اسی طرح روزے میں مطلع فجر سے غروب آفتاب تک کھانا پینا یا جنسی خواہش پوری کرنا منع ہے۔ اب جو اس کے برعکس کوئی بات کہے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ نیز مسلمانوں کی جماعت پر جھوٹا باندھتا ہے۔

ان متفق علیہ چیزوں کے بارے میں کسی شخص کا ازہر نو غور و خوض کرنا اور نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کرنا سوائے لغویت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔

فقہ اور معاشرہ

ہماری روایتی تہذیب میں فقہ کا مطالعہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، کیونکہ فقہ کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں وہ سارے افعال آجاتے ہیں جن کا اہل ایمان کو مکلف بنایا گیا ہے۔ پھر اس میدان میں اسلامی قوانین و احکام جامع حد تک پہنچ چکے ہیں اور یہ جامعیت اسلام کی امتیازی خصوصیات میں ہے۔

جو دین ایسی امت تشکیل دے رہا ہو جو ایک دوانی پیغام کی علمبردار ہو اور جس کی صلاحیتیں اس کی تعلیمات میں مضمر ہوں وہ خاص یا عام طرز عمل میں کوئی خسران نہیں چھوڑ سکتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ پر شروع ہی سے ہر چیز میں قانونی طرز فکر کی چھاپ رہی ہے اور اسلامی تعلیمات اس کے نظام میں شروع سے آخر تک دخل انداز ہیں۔ وہ کیسے کھائے اور کیا کھائے؟

کیسے استنجا کرے اور کیسے طہارت حاصل کرے؟

کیسے صلح و امن قائم کرے، کیسے جنگ کرے؟

بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں عالمی خاندان کے ممبروں کے ساتھ کیسے بقائے

باہم کرے؟ وغیرہ وغیرہ

پھر ان معاملات کو غیر اہم سمجھ کر ترک بھی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان کے بارے میں

معلومات حاصل کرنا عین دین اور کتاب و سنت پر عمل کا حصہ تھا۔
اسی لیے جب زوال و پیمانہ نگہ کے دور میں اسلامی تہذیب انحطاط کا شکار ہوئی تو
مختلف عظیم علوم و معارف ہمارے ہاتھ سے نکل گئے۔

وہ اہم کائناتی، معنوی و ادبی اور فنی علوم جو اسلامی راجدھانیوں میں پروان چڑھ
رہے تھے دھیرے دھیرے معدوم ہوتے چلے گئے۔

عوام نے ان کی حیثیت ثانوی اور ذیلی سمجھی اس لیے انہیں کھونے کا احساس بھی

نہیں ہوا۔
لیکن فقہ اپنی جگہ مستحکم بنیادوں پر جمی رہی۔

تیس سال پہلے بھی ہم دینی درسگاہوں میں فقہ کے ایسے ابواب پڑھتے تھے جن
میں وضو و غسل کے طریقوں کے ساتھ امن و جنگ کے معاہدوں وغیرہ جیسے بین الاقوامی قانونی
موضوعات شامل تھے

فقہ کی کتابوں میں مسائل و احکام کا یہ زبردست ذخیرہ ہمیں فقہاء کی گہری نظر اور
زندگی اور سیاست کے میدانوں میں زبردست مہارت کا ثبوت فراہم کرتا ہے کسی دوسری
تہذیب میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

فقہ عبادات

عبادات سے متعلق فقہ کے بحرِ ذخار کے بعض گوشوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات کے تعلق سے تمام شرعی احکام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہیں۔ انسان کا کام پس ان احکام کا نفاذ ہے اسے خود کوئی چیز تجویز کرنے یا ایجاد کرنے کا حق نہیں۔ اسلام نے جو عبادات فرض کی ہیں ان کی حیثیت مبہم رسموں کی نہیں بلکہ وہ سمجھ میں آنے والے واضح اعمال ہیں۔

تمام عبادات کو ترقی یافتہ فلسفہ اور بہترین نفسیاتی علاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ حجاج کرام جو دینی مناسک ادا کرتے ہیں ان کا تعلق تاریخی یادگاروں اور جذباتی احساسات سے ہے جن سے انسان بے نیاز نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ جو مادی نظام صرف عقل کو قابل احترام مانتے ہیں وہ بھی ان سے خالی نہیں۔

اعلیٰ مضامین و مقاصد کے ساتھ عوام کو مربوط کرنے میں ان کی حکمت ظاہر و نمایاں ہے۔ اسلامی عبادات کا محور تزکیہ نفس، اخلاص نیت، انسانی طبیعت میں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خشوع و خضوع کے جذبات پیدا کرنا اور پھر زندگی اور انسانوں کے ساتھ پاکیزہ جذبہ کے ساتھ معاملہ و سلوک کرنا ہے۔

بنی آدم اس دنیا کے سردار ہیں اور عام حقوق و فرائض میں انھیں اپنے پروردگار کے سامنے عمل کر کے دکھانا ہے۔

کوئی مذہب یا رہنمایا سیاسی لیڈر بھی اس معاملے میں دوسروں کے مقابلے میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔ عوام کی طرح خواص کی نجات کا دار و مدار بھی اللہ تعالیٰ سے بہترین تعلق اور اخلاص نیت و حسن عمل پر ہے۔

اختلاف رائے کے اسباب

عبادات کے تعلق سے اجتہاد کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو جاننے کی کوشش کی جائے کسی بھی فقیہ کی ایسی کوئی ذاتی رائے نہیں ہے جس کی پیروی کو وہ دینا سمجھتا ہو۔

فقہی مسلک کے ایک مقلد کا یہ ٹھوس جواب مجھے بہت پسند آیا۔
اس سے دریافت کیا گیا کہ کیا تم امام ابوحنیفہؒ کی بات کی پیروی کرتے ہو؟
اس نے جواب دیا: نہیں! میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات کی پیروی کرتا ہوں
اس تشریح کے مطابق جو امام ابوحنیفہؒ نے کی ہے۔
تقلید کے سلسلہ میں یہ جواب سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ یا دوسرے
ائمہ کی ذاتی پیروی نہیں کی جاتی۔

یہاں مسلکی تقلید — جو آج کل مسلم ممالک میں رائج ہے — کی تائید کرنا
مقصد نہیں صرف ایک نقطہ نظر کو پیش کرنا مقصود ہے۔
عبادات کے تعلق سے اجتہاد کے کچھ اسباب اور ان کے نتائج کو سمجھنے کی ضرورت ہے
جس نص کے ثبوت کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں، سمجھنے والے اپنے ذہنی مزاج
یا الفاظ کے لغوی مزاج کے اعتبار سے اس کو سمجھنے میں کبھی مختلف رایوں تک پہنچ
جاتے ہیں۔

اسی طرح احادیث نبویہ کی سند (یعنی راویوں) کے بارے میں مختلف علماء کی رائیں

پھر اس کے نتیجے میں احکام کے استنباط میں اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے۔
مثلاً کیا عورت نماز کی امامت کر سکتی ہے؟

بعض لوگوں کی رائے میں مطلقاً نہیں کر سکتی، بعض لوگوں کی رائے میں مطلقاً کر سکتی ہے اور بعض لوگوں کی رائے میں صرف عورتوں کی امامت کر سکتی ہے۔

اور یہ کسی خاص نظر یہ کو ترجیح دینے کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنیاد پر ہے کہ مجتہد کے نزدیک سنت رسولؐ سے صحیح طور پر کیا ثابت ہے؟

اس بنا پر بہت سے مسائل میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔

یعنی مروی احادیث کے مراتب قائم کرنے میں اختلاف رائے کی وجہ سے راویوں کو مستند یا غیر مستند ماننے اور پھر سندوں کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کے قابل احترام علمی اصولوں کی بنیاد پر اگر اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے تو گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات بھی نہیں۔

پروفیسر محمد تقی قمی جو اسلامی ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی دعوت کے علمبردار ہیں لکھتے ہیں:

”و شیعہ بھی سنیوں سے اس بات میں اختلاف رائے نہیں رکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کی جائے۔ تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل ماننا ناگزیر ہے۔ فرق یہ ہے کہ رسالت کے دور میں مسلمان براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول سنتے تھے یا عمل دیکھتے تھے اور بعد کے لوگوں کو سنت راویوں کے واسطوں سے پہنچتی ہے۔ اور یہیں روایت کی صحت کو پرکھنے کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور اس میں اختلاف رائے ہوتا ہے، گویا اختلاف سنت کے بارے میں نہیں بلکہ سنت کی سند کے بارے

میں ہوتا ہے، اور ایسا ہی اختلاف کبھی شیعوں اور سنیوں کے درمیان بھی ہوتا ہے۔ علمائے منطق کی اصطلاح میں اسے صفرویی اختلاف کہہ سکتے ہیں یعنی جو کلام رسولؐ ہے تمام فرقوں کے نزدیک اس کی پیروی واجب ہے۔ اختلاف رائے صرف سند روایت

یعنی اس میں ہوتا ہے کہ وہ کلام رسولؐ سے ثابت ہے یا نہیں۔

جس طرح خدا اور رسول اللہؐ سے نسبت کی درجہ بندی میں اختلاف رائے ہوتا ہے اسی طرح کسی مسئلہ نص کے سمجھنے کے تعلق سے بھی اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔

مثلاً پروفیسر محمد جواد منینت اس آیت کے بارے میں:

وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْخَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ۔ (المائدہ - ۵ - ۶)

اور اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آیا ہو یا عورتوں کو چھوا ہو پھر پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو اور اس سے اپنے منہ اور ہاتھ تھو لو۔

لکھتے ہیں کہ: احکام والی آیات میں اس آیت سے زیادہ کسی اور کے تعلق سے مختلف اقوال نہیں ملتے۔

اس میں بھی اختلاف رائے ہے کہ تیمم کس پر واجب ہوگا کیا صرف مریض اور مسافر پر یا جسے بھی پانی نہ ملے۔

مس سے مراد جماع ہے یا صرف ہاتھ سے چھونا بھی ہے۔

پانی سے مراد مطلقاً پانی ہی ہے یا پانی میں کوئی چیز ملی ہوئی ہو تو بھی اس تعریف میں آئے گا۔

صعید سے مراد صرف مٹی ہے یا ریت اور پتھر وغیرہ دیگر زمینی چیزیں بھی۔ چہرے سے مراد پورا چہرہ ہے یا اس کا کوئی حصہ۔

ہاتھ سے مراد پھیلی ہے یا بازو بھی۔

ایام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ مسافر و مریض کو اگر پانی نہ ملے تو ان پر تیمم واجب ہوگا۔ مقیم اور صحت مند کے لیے پانی نہ ملنے پر بھی تیمم نہیں ہے (المعنی لابن قدامہ و بدایۃ المجتہد) ان کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں صرف پانی نہ ملنے کا ذکر نہیں بلکہ ساتھ میں سفر یا مرض کی شرط بھی ہے۔

دیگر سارے مسالک میں پانی نہ ملنے پر تمیم و نماز واجب ہوگی چاہے مسافر ہو یا مقیم اور چاہے مریض ہو یا تندرست، کیونکہ حدیث سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔
شافعی مسلک میں لمس سے مراد ہاتھ سے چھونا بھی ہے۔ البتہ غیر عورت کو بغیر کسی درمیانی چیز کے براہ راست چھونا مراد ہے۔

امامی مسلک میں لمس سے مراد جماع ہے کیونکہ عرب لمس سے مراد جماع ہی لیتے ہیں حنفی اور امامی مسلک میں صیغہ سے مراد مٹی، ریت اور پتھر ہے البتہ معدنیات اس میں شامل نہیں۔ شافعی مسلک میں صرف مٹی اور ریت مراد لی جاتی ہے۔ پتھر نہیں۔ جنسلی مسلک میں اور بعض امامیوں کے نزدیک صرف مٹی مراد ہے۔ مالکی مسلک میں اس سے مراد مٹی کے ساتھ ریت، پتھر، برف اور معدنیات بھی لیتے ہیں اگر انھیں ان کی اصل جگہ سے ہٹایا نہ گیا ہو البتہ سونا، چاندی اور جواہرات شامل نہیں۔

ائمہ اربعہ کے نزدیک چہرے سے مراد پورا چہرہ ہے جیسا کہ وضو میں جبکہ امامی مسلک میں چہرے کا جز مراد ہے۔

ائمہ اربعہ کے نزدیک ہاتھوں سے مراد وضو کی طرح ہتھیلیوں سے لے کر کہنیوں تک ہے جبکہ امامی مسلک میں صرف ہتھیلیاں مراد ہیں۔
ابن رشد کہتے ہیں کہ ہاتھ سے مراد کلام عرب میں کبھی صرف ہتھیلی لی جاتی ہے کبھی ہتھیلی اور کہنیوں تک اور کبھی بازو تک بھی۔

الغرض ان اقوال سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلوں کے درمیان اختلاف رائے معنوی نہیں لفظی نوعیت کا ہے اور وہ بھی بنیادی اصولوں میں نہیں بلکہ فروعات میں۔
وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت میں کتنی لچک اور اجتہاد کرنے اور آسانی پیدا کرنے کی کتنی زبردست گنجائش پائی جاتی ہے۔“



اب کیا ان مذہبی مسلوں میں کسی ایک کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حق پر سمجھا جاسکتا ہے؟ نہیں، اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

اب یا تو آپ سب کو حق کی مختلف صورتیں اور صحیح سمجھیں۔

یا پھر یہ سمجھ لیں کہ کسی مسئلے میں حق پران میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے لیکن اس کی تعین نہیں کی جاسکتی۔ حق کو واضح کرنے کے لیے ہی مجتہدین نے استنباط کرنے کی کوششیں کی ہیں اور ان کوششوں کا اجر ان سب کو ملے گا۔

جو غلط نتیجے تک پہنچا اسے بھی اپنی کوشش کا اجر ملے گا۔

اور جو صحیح نتیجے تک پہنچا۔۔۔ اور ہم متعین طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ کون پہنچا۔

اسے بھی اجر ملے گا اور دگنا ملے گا۔

ان میں سے کسی کو برا سمجھنے یا گمراہ قرار دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

نہ یہ ماننے کی گنجائش ہے کہ بس وہی حق ہے اور اس کے سوا حق نہیں۔

پہلے کے مجتہدین اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے اسی لیے ان میں سے ہر ایک

نے دوسرے پر سختہ چیلنی کرنے یا اسے اپنی رائے ماننے پر مجبور کرنے سے انکار کیا۔

خلیفہ منصور عباسی نے حج کے موقعہ پر امام مالکؒ سے کہا کہ: میرا ارادہ ہے کہ میں

آپ کی کتاب (موطا) کے نسخے نقل کرا کے تمام اسلامی علاقوں میں بھجوادوں اور یہ حکم جاری

کروں کہ بس اسی کے مطابق عمل کیا جائے، امام مالکؒ نے کہا امیر المؤمنین! ایسا مت

کیجیے (مختلف علاقوں کے) لوگوں تک بہت سی احادیث پہلے سے پہنچ چکی ہیں اور وہ

ان کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ جہاں کے لوگوں نے اپنے لیے جو کچھ اختیار کر لیا ہے انھیں اسی

پر عمل کرنے دیجیے۔

میری رائے میں فقہی مسالک ہیں رائج بیشتر اقوال حق ہیں اور ان کی بنیاد زمان و مکان

کے فرق و مناسبت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل پر ہے۔

آپ نے کبھی نماز میں ہاتھ باندھے، کبھی تھوڑے رکھے۔

کبھی رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھ اٹھائے، کبھی نہیں اٹھائے۔

اقامت میں تکبیر کے کلمات ایک ایک بار بھی کہنے دیے اور دو دو بار بھی۔

اور ان باتوں سے وہ تنگی ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی جو آج تنگ نظری اور جہالت کی وجہ سے

پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

کچھ بنیادی اصول ہیں جن کے تعلق سے اہل ایمان میں کوئی اختلاف رائے نہیں پایا جاتا۔ اگر ہم ان پر عمل کرتے رہیں تو پھر معمولی باتوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔ استاد محمد تقی قہنی لکھتے ہیں:

”کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ وہ بنیادی اصول کیا ہیں جنہیں مسلمانوں اور دیگر لوگوں کے درمیان حدِ فاصل مانا جاسکے۔

تو ہم مثال کے طور پر بتا سکتے ہیں کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کو پروردگار مانتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی و رسول مانتے ہیں۔ قرآن کو کتاب الہی مانتے ہیں، کعبہ کو قبلہ مانتے ہیں۔ یہ مانتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد توحید و رسالت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر ایمان پر ہے اور یہ کہ اسلام اللہ کا آخری دین ہے اور حضرت محمدؐ آخری رسول ہیں۔ حضرت محمدؐ جو کچھ لے کر مبعوث ہوئے وہ حق ہے، قیامت حق ہے، پھر سے اٹھایا جانا حق ہے آخرت میں جزا ملنا حق ہے، جنت حق ہے اور جہنم حق ہے وغیرہ۔ اور جس چیز میں اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول پر ہے۔

یعنی ہم اختلاف رائے کے طریقے پر متفق ہیں ہم میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ حکم اللہ یا اس کے رسول نے دیا ہے پھر بھی ہم نہیں مانتے۔

یا کوئی یہ نہیں کہتا کہ: اللہ اور اس کے رسول نے فلاں چیز پر ایمان لانے کا ہمیں مکلف بنایا ہے پھر بھی ہم اس پر ایمان نہیں رکھتے۔

نہ کوئی دین کی کسی ضروری بات کا انکار کرتا ہے۔

اختلاف رائے کرنے والے صرف اس میں اختلاف رائے کرتے ہیں کہ فلاں چیز کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے یا نہیں یا فلاں چیز میں اجتہاد کی گنجائش ہے یا نہیں۔ گویا اختلاف رائے اس پر ہوتا ہے کہ فلاں چیز کا حکم اللہ اور اس کے رسول سے ثابت ہے یا نہیں۔ جبکہ یہ بالاتفاق تسلیم کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب ہے اور شریعت الہی کا مرجع و ماخذ قرآن و سنت ہی ہیں۔“

معاملات

دین کی آمد سے پہلے بھی لوگ باہم معاملات کیا کرتے تھے۔
معنوی و مادی ربط کی بہت سی صورتیں ان انسانی ضروریات میں سے ہیں جو آسانی
ہدایت پر منحصر نہیں ہیں۔

اسلام کی آمد سے پہلے اور ان علاقوں میں جہاں اسلام نہیں پہنچ سکا، لوگوں
کے درمیان اقتصادی، سماجی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں وحی کا کام یہ ہوا کہ ان معاملات
کو آلائشوں سے پاک صاف کر دے اور انہیں اپنے اصولوں اور مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ
کر دے۔ اگر وہ معاملات پہلے ہی سے درست تھے تو ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ انہیں
ویسے ہی برقرار رہنے دیا گیا۔

مثلاً سامان کی فروخت ایک عام معاملہ ہے۔ اسلام نے صرف یہ چاہا کہ اسے
ملاوٹ، فریب دہی اور سود وغیرہ سے پاک کر دے۔

معاملات میں خرابی خود پسندی، مفاد پرستی اور بددستی وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے اسی لیے
اسلام نے معاملات میں مصلحت عامہ اور انصاف کی رعایت کو بنیادی اہمیت دی ہے اور
مصلحت عامہ و انصاف کے قیام و تحفظ ہی کو معاملات سے متعلق تمام تصرفات کی بنیاد قرار
دیا ہے ان اصولوں کو عملی تطبیق بھی دی ہے۔ محض قانون کے اصول و اغراض کے نظریاتی
وقتی مطالعے تک محدود نہیں رکھا ہے۔

قانون کا مزاج خشک ہوتا ہے لیکن شریعت کے احکام روح، دل اور جذبات

کو بھی اپیل کرتے ہیں۔

آپ اگر جائزہ لیں کہ اسلام لوگوں کے معاملات میں کیا طرز عمل اختیار کرتا ہے تو آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ وہ ان میں کس طرح اپنے آسمانی مزاج کی روح پھونک دیتا ہے۔ وہ خشک قانونی عبارتوں کو اخلاق و ادب کی نصیحتوں اور ہدایتوں میں ڈھال دیتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ معاملات کا انحصار مصلحت عامہ پر رکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کچھ لوگ ماننا چاہیں اسے نیک عمل قرار دے دیا جائے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ اسلام نے جس چیز کو حرام قرار دے دیا ہے جیسے سو دیا زنا، اسے انسانی مفاد و مصلحت کی چیز نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔

اسی طرح دونوں فریقوں کی رضامندی بھی ان برائیوں کو جائز نہیں بنا سکتی چاہے تمام دنیاوی قوانین اسے جائز قرار دینے لگیں۔

یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ دینی احکام معاشرے کے پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور اس کا کوئی پہلو نہیں چھوڑتے، یہاں سارے پہلوؤں کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں تاہم ہم دو پہلوؤں کا ذکر کریں گے جن سے سارے معاملات میں اسلامی چھاپ اور رنگ کی نوعیت واضح ہو جائے گی۔

کچھ معاملات خرید و فروخت، لین دین، رہن اور قرض وغیرہ کاروباری امور سے متعلق ہوتے ہیں اور کچھ معاملات جنگ و امن، دعوت، قبول و انکار اور صلح وغیرہ سیاسی امور سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں قسم کے معاملات کے سلسلے میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بازار میں بیچنے کے لیے کوئی سامان رکھا اور اس کے بیچنے کے سلسلے میں قسم کھائی تو یہ آیت نازل ہوئی:

ان الذین یشترون بعہد اللہ
وایمانہم ثمنا قلیلا اولئک لا
حلاق لہم فی الآخرۃ ولا

جو لوگ اللہ کے قرار پر اور اپنی قسموں پر تھوڑا سا
مولے لیتے ہیں ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں
قیامت کے دن ان سے نہ الشربات کرے گا

يَكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ وَلَا يَزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ (آل عمران۔ ۷۷)

اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ ان کو پاک
کرے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے جو کوئی غذائی جنس بیچ
رہا تھا آپ نے اس سے دام پوچھے اس نے بتا دیے۔ آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو اسے
پانی سے نم پایا۔ آپ نے دریافت کیا یہ کیلہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ بارش کا پانی پڑ گیا
ہے آپ نے فرمایا تو اسے اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ سکتے؟ پھر آپ نے فرمایا جس
نے فریب کاری کی وہ ہم میں سے نہیں۔ (ابوداؤد و مسلم)

حضرت حکیم بن حزامؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”خرید و فروخت کرنے والے جب تک الگ نہ ہو جائیں انھیں (سودا منسوخ کرنے
کا) اختیار باقی رہتا ہے۔ اگر دونوں سچائی سے کام لیں گے تو ان کے سودے میں برکت ہوگی۔
اور اگر جھوٹ بولیں گے اور چھپائیں گے تو اس کی برکت مٹا دی جائے گی۔“ (بخاری)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باہر
(دیہاتوں سے) سودا لے کر بیچنے آنے والے سواروں سے (شہر کے باہری) نہ ملو اور نہ کوئی
شہری کسی دیہاتی کے لیے بیچے (یعنی دلالی نہ کرے) (مسلم)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایسا سخت زمانہ آئے گا جب خوشحال لوگ اپنی دولت
میٹھے رہیں گے جبکہ انھیں اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
وَلَا تَسْوَأِ الْقَاضِلَ بَيْنَكُمُ (مبقرہ ۲۲۷) اور آپس میں احسان کرتا نہ بھلا دو۔

اسی طرح مجبوری کی حالت میں خریداری ہوگی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
مجبور آدمی کی طرف سے فروخت کو منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

یعنی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یا اسے مجبور کر کے اس کا سامان کم قیمت پر
نہ لیا جائے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے

کھلانے والے اس کی دستاویز لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ وہ سب برابر ہیں۔ (مسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں رواج یہ تھا کہ کھجور کی فصلیں ایک ایک دو دو سال پہلے سے بیچ دی جاتی تھیں آپ نے ہدایت دی کہ مقررہ وزن، مقررہ قیمت اور مقررہ مدت کے ساتھ سودا کیا جائے۔ (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں دو شریکوں کے درمیان تیسرا رہتا ہوں جب تک ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے خیانت نہ کرے۔ جب خیانت کر لیتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔ (ابوداؤد)

حضرت عروہ باریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قربانی کا جانور یا بکری خریدنے کے لیے ایک دینار دیا۔ انھوں نے اس سے دو بکریاں خریدیں پھر ایک بکری ایک دینار کی بیچ دی اور ایک بکری اور ایک دینار لے لیے آپ نے ان کے لیے کاروبار میں برکت کی دعا فرمائی۔ پھر یہ حال ہو گیا کہ اگر وہ مٹی بھی خرید لیتے تو فائدہ ہو جاتا۔ (ابوداؤد)

حضرت عمر بن عوف مزنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ جائز ہے جب تک کہ اس سے کوئی حرام چیز حلال یا حلال چیز حرام نہ ہو جائے۔ اور مسلمانوں کی شرطیں برقرار رہیں گی جب تک کسی شرط سے حلال چیز حرام یا حرام چیز حلال نہ ہو جائے۔“ (ترمذی)



حضرت عطار بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو کسی مہم پر بھیجا اور فرمایا کہ جاؤ اور کسی طرف متوجہ نہ ہونا۔ انھوں نے دریا

کیا: یا رسول اللہ! ان کے ساتھ کس طرح پیش آؤں گا؟ آپ نے فرمایا جب ان کے علاقہ میں پہنچ جاؤ تو اس وقت تک جنگ نہ کرنا جب تک وہ تمہارے کسی آدمی کو قتل نہ کر دیں۔ اور اگر کسی کو قتل کر دیں تب بھی اس وقت تک جنگ نہ کرنا جب تک انھیں مقتول کو دکھانے کو پھر ان سے کہنا کہ کیا تم لوگ کلمہ شہادت پڑھتے ہو؟ اگر وہ ہاں کہیں تو کہنا کیا تم نماز پڑھو گے؟ اگر وہ کہیں ہاں تو کہنا کیا تم اپنے مال کا صدقہ نکالو گے اگر وہ کہیں ہاں تو پھر اس سے زیادہ کچھ اور مت طلب کرنا۔ خدا کی قسم تمہارے ہاتھوں ایک آدمی ہدایت پا جائے یہ تمہارے لیے ہر چیز سے بہتر ہے۔ (احمد)

حضرت عبدالرحمن بن عائد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی لشکر بھیجتے تھے تو فرماتے تھے:

لوگوں کے ساتھ انیت و الفت سے پیش آنا، جب تک انھیں دعوت نہ دے لو حملہ نہ کرنا۔ کوئی ایک گھر بھی تمہارے ہاتھوں مسلمان ہو جائے یہ مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ تم ان کے مردوں کو قتل کرو یا عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر لاؤ۔

(تیسیر الاصول)

حضرت ابو بکرؓ نے حضرت یزید بن ابوسفیان کو ایک لشکر کا سردار بنا کر بھیجتے ہوئے دس باتوں کی نصیحت فرمائی، ان میں یہ باتیں بھی تھیں کہ خانقاہوں میں گوشہ نشین راہبوں کو کو نہ مارنا، کسی بچے، عورت کو اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا اور کھانے کی ضرورت کے علاوہ کسی مویشی کو ذبح نہ کرنا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایک آدمی دنیاوی فائدے کے لیے جہاد کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کے لیے کوئی اجر نہیں۔ یہ بات لوگوں کو بھاری لگی انھوں نے اس شخص کو پھر بھیجا کہ شاید تم اپنی بات رسول اللہؐ پر واضح نہ کر سکے ہو۔ وہ آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! ایک آدمی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔ لوگوں نے

تیسری بار پھر اسے بھیجا اور اس نے وہی سوال دریافت کیا آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ
اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔ (ابوداؤد)

مسلمانوں کے ایک لشکر نے ایران کے محل کا محاصرہ کیا۔ لشکر کے سردار حضرت سلمان ^{رض}
فارسی تھے لوگوں نے کہا کیا حملہ نہیں کریں گے؟ انھوں نے کہا پہلے مجھے انھیں دعوت دینے
دو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دیتے تھے چنانچہ وہ گئے اور کہا میں تمہیں میں
سے ایک آدمی یعنی ایرانی ہوں۔ عرب میری اطاعت کرتے ہیں اگر تم اسلام قبول کرو تو تمہارے
حقوق اور ذمے داریاں بھی وہی ہو جائیں گی جو ہماری ہیں یا پھر جزیہ دینا مان لو ورنہ پھر
مقابلہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہم مقابلہ کریں گے۔ حضرت سلمان تین روز تک انھیں دعوت
دیتے رہے پھر جنگ شروع کرنے کی اجازت دی۔ جبکہ ایران کے ساتھ حالت جنگ جاری تھی
حضرت معاویہ اور رومیوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا جب اس کی مدت ختم
ہوگئی تو انھوں نے حملہ کر دیا ایک شخص گھوڑے پر سوار آیا اور کہنے لگا ”وفاداری کرو غداری
نہیں۔ وہ حضرت عمرو بن عبسہ تھے۔ حضرت معاویہ نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے
بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس کا کسی قوم کے ساتھ
معاہدہ ہو وہ اسے ختم نہ کرے۔ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ہم غزوہ خیبر کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ نکلے آپ نے وادی القریٰ کا رخ کیا۔ آپ کو ایک سیاہ فام غلام ہدیہ ملا تھا
جس کا نام مدغم تھا، وہ آپ کا سامان ٹھیک کر رہا تھا کہ اسے تیر لگا اور وہ مر گیا۔ لوگوں
نے کہا اس کے لیے جنت کی خوشخبری ہو۔ آپ نے فرمایا نہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضے
میں میری جان ہے خیبر کے دن اس نے مالِ غنیمت سے جو شملہ تقسیم سے پہلے اٹھالیا
تھا وہ اس پر آگ جلا رہا ہے۔ یہ سن کر ایک آدمی جو تھے کا ایک تمہ یا دو تمہ لایا۔ آپ
نے فرمایا یہ آگ کے تمہے تھے۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے
زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا اور فرمایا:

ابو سحر و جاؤ۔ قیامت کے دن مجھے اس طرح نہ ملنا کہ تمہارے پیٹھ پر زکوٰۃ کا کوئی
اونٹ، جسے تم نے ہڑپ کر لیا ہو، بیلارہا ہو۔
انہوں نے کہا: تب میں نہیں جاؤں گا۔
آپ نے فرمایا: تب میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔
حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے
ہوئے سنا:

”جس نے کسی ذبی کو بلا وجہ قتل کیا اس پر اللہ تعالیٰ جنت حرام کر دے گا۔“
ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس پر جنت کی خوشبو حرام کر دے گا۔

شریعت کا مزاج

اسلام ان ہدایات سے بھرا ہوا ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں اور ماننے والے کے لیے سلامتی و استقامت کے راستوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یہاں ہر میدان میں اسلامی تعلیمات کا ذکر مقصود نہیں تاہم یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان ہدایات کو پڑھ کر ایک شخص مختلف معاملات میں اسلام کی روح اور حکمت کو جان سکتا ہے۔

فقہاء نے ایسے قواعد اور اصول منضبط کر دیے ہیں جن سے قانونی پیچیدگیوں کو حل کیا جاسکتا ہے اور اہل دانش ان کی بنیاد پر زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ہدایات فراہم کر سکتے ہیں۔

معاملات کے میدان میں رسول کریمؐ سے جو سنتیں ہیں ملی ہیں وہ ایک زبردست قیمتی ورثہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور کسی اور سے اتنی رہنمائی نہیں مل سکی۔ آج فکری و نظریاتی یلغار کے زیر سایہ پرورش پانے والی نسل اس قیمتی ورثہ کی قدر و قیمت سے نا آشنا ہے۔

مختلف مثالوں سے باسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ:

— اسلام نے کس طرح معاملات کو حسن نیت اور اعلیٰ مقصدیت کے ساتھ مربوط کیا۔

— شریعت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں زندگی کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔

— یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سنتیں جزئی اور غیر مربوط احکام کی حیثیت نہیں رکھتیں۔

بلکہ ان کے درمیان ربط ہے اور وہ ایک ہی روح کے مختلف مظاہر ہیں اور

ان کا مقصد لوگوں کے حالات کو ایک نظام سے مربوط کرنا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ لکھتے ہیں:

”یہ فطری بات ہے کہ شریعت کا مقصد تمام انسانوں کے مفاد کا تحفظ ہو۔ نسل و ذریعہ کی بنیاد پر کوئی فرق و امتیاز نہ کیا جائے۔ امام شاطبیؒ کہتے ہیں کہ ”ہم تمام نصوص کو پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شریعت نے تمام بندوں کے مفاد کو اپنا مقصد بنایا ہے اور مفادِ عام ہی پر معاملات کے عام احکام مبنی ہیں اور مصلحتِ عامہ کے ساتھ اس طرح کے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔“

چونکہ لوگوں کی مصلحتیں باہم ٹکرا بھی سکتی ہیں یعنی ایک کی بھڑائی میں دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول بتا دیا کہ ”نہ کوئی کسی کو نقصان پہنچائے نہ لوگ باہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں۔“

اب اس اصول کی تطبیق بہت سی صورتوں میں ہو سکتی ہے مثلاً مفادِ عامہ کے لیے شرک یا نہر وغیرہ کی توسیع و تعمیر کی غرض سے فرد کی ملکیت کا حق چھینا جاسکتا ہے یا مثلاً کسی محتاج رشتہ دار کا خرچ اس کے رشتے دار پر ڈالا جاسکتا ہے یا مثلاً خوشحال مقروض کو قرض کی رقم ادا کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے چاہے اسے قید ہی کرنا پڑے۔



یحییٰ بن آدم قریشی نے اپنی کتاب ”الخراج“ میں روایت نقل کی ہے کہ ضحاک بن خلیفہ انصاری کا ایک کھیت تھا جس میں سچائی کے لیے پانی بھی پہنچ سکتا تھا جب محمد مسلم کے باغ میں سے گزرے۔ محمد مسلم نے اپنے باغ سے پانی لے جانے کو منع کر دیا یعنی اپنی زمین میں نالی بنانے کی اجازت نہیں دی۔

ضحاک حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور معاملہ پیش کیا۔

حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلم سے دریافت کیا: تمہارا کوئی نقصان ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: خدا کی قسم اگر سوائے تمہارے پیٹ کے اور کوئی دوسرا راستہ نہ ملتا تو میں

اس سے پانی گزار دیتا جاؤ، پانی جانے دو۔

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن سے صاحب بصیرت فقہار نے اہم نتائج نکالے ہیں۔ شیخ محمد یوسف موسیٰ لکھتے ہیں:

”اسلامی فقہ حقدار کا حق محفوظ رکھتی ہے اور اسے حسب مرضی استعمال کرنے کی اجازت دیتی ہے اور دوسروں کو اس کا حق پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتی بشرطیکہ حقدار کے اپنے حق کے استعمال سے دوسروں کو اس حد سے زیادہ نقصان نہ پہنچے جتنا حقدار کو حق کے استعمال کی آزادی حاصل ہے اور یہ اسی اصول کی بنیاد پر کہ (نہ ایک شخص دوسرے شخص کو نقصان پہنچائے نہ لوگ باہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں) اور یہ کہ دو نقصان وہ چیزوں میں سے کم تر نقصان وہ چیز کو اختیار کر لیا جائے۔“

شیخ علی حسب اللہ لکھتے ہیں کہ علماء نے دین کے احکام و مقاصد کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

- ۱۔ وہ مصالح جن پر زندگی کا دارومدار ہے، انھیں مصالح ضروریہ کہا جاتا ہے اور وہ پانچ چیزوں کی حفاظت سے تعلق رکھتی ہیں: دین، جان، عقل، نسل اور مال۔ احکام شریعت زیادہ تر انھیں سے متعلق ہیں۔
 - ۲۔ وہ مصالح جن کے بغیر زندگی تہ وبالا تو نہیں ہوتی لیکن ان کے بغیر تنگی اور مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں ضرورت والے مصالح کہا جاتا ہے بہت سے احکام شریعت ان سے بھی متعلق ہیں مثلاً، اشیاء کا تبادلہ، بعض مکلف چیزوں میں بعض اوقات چھوٹ۔
 - ۳۔ کچھ مصالح عادات کی بہتری سے متعلق ہیں جیسے ستر پوشی اور ناپاک کھانوں کی حرمت وغیرہ، انھیں تحسین مصالح کہا جاتا ہے۔
- شریعت کے احکام ان سارے مصالح کا تحفظ کرتے ہیں کیونکہ شریعت مکمل بھی ہے اور لوگوں کے لیے عدل، انصاف اور نرمی کی علمبردار بھی۔
- اسی لیے اسلامی شریعت ہر زمان و مکان میں انسانوں کے لیے مناسب ہے۔

حکم الہی کی نوبت

انسانوں کے لیے یہ درست ہے نہ مناسب کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو پروردگار یا حاکم حقیقی مان لیں جو کسی غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ حق کا انکار اور نعمت کی ناشکری کرتا ہے یہی حال اس کا بھی ہے جو اللہ کے دیے ہوئے حکم کے بجائے کسی دوسرے کا حکم مانتا ہے۔

آخر ہم کسی انسان کو یہ حق کیسے دے سکتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم دینے، منع کر دینے یا حلال و حرام ٹھہرانے کے حق میں سا بھی ہو جائے؟

کسی انسان کو یہ حق کیسے پہنچ سکتا ہے کہ وہ کلام الہی کو ایک طرف ڈال دے اور خود اپنی طرف سے احکام گھڑ لے اور پھر یہ بھی سمجھے کہ وہ اللہ کے احکام سے زیادہ پیروی کے لائق ہیں۔ کیا وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا ہے؟

کیا اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی جو ضرورتیں بھول گئی تھیں وہ اسے یاد آگئی ہیں؟
 الہی شریعت کو نظر انداز کر کے کسی انسانی شریعت کو ماننا بدترین جہالت ہے۔
 اَفَغَيَّرَ اللَّهُ اٰبَتِيْ حَكْمًا وَّهُوَ السَّيِّدُ
 سو کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں
 اَنْزَلَ اِلَيْكُمْ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا
 حالانکہ اس نے تم پر واضح کتاب اتاری۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاٰمْرُ تَبَارَكَ اللهُ
سُن لُو اَسِي كَا كَام هِي پِي دَا كَرْنَا اُو ر حَكْم فَرْمَا نَا بَرِي
رَبُّ الْعَالَمِيْنَ - (الاعراف - ۵۴) بركت والا هِي الشَّرُّ جُو سَارِي جِهَانِ كَارِب هِي۔

بلاشبہ آسمانی شریعتوں کو بھلا دینا گناہِ عظیم ہے بلکہ اس گناہ اور دوسرے انفرادی گناہوں کے درمیان یہ فرق بھی ہے کہ انفرادی غفلت، کمزوری یا لغزش وغیرہ کی وجہ سے انفرادی گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں جبکہ آسمانی احکام کو پس پشت ڈالنا جان بوجھ کر، اعلانیہ طور پر اور اللہ تعالیٰ سے بے خوفی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حق کو چھوڑ کر خواہشِ نفس کے پیچھے دوڑنے والوں کو وعید سناتا ہے :

يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ
اے داؤد ہم نے تم کو ملک میں نائب بنایا سو
فَاَحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا
تم لوگوں میں انصاف سے حکومت کرو اور
تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ
دل کی خواہش پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کی راہ سے
اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ
گمراہ کرنے۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بہکتے ہیں
سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ
ان کے لیے سخت عذاب ہے اس بات پر کہ
يَمَانُوْا يَوْمَ الْحٰجَابِ - (ص - ۲۶) انھوں نے حساب کا دن بھلا دیا۔

سلوک و معاملات میں تو اللہ تعالیٰ کے احکام کو نگاہوں سے اوجھل کرنا خواہشاتِ نفس کی بنیاد پر ہوتا ہے لیکن قانون سازی کے میدان میں اس دعویٰ کے ساتھ ہوتا ہے کہ منطق کا تقاضا یہی ہے یا مصلحت عامہ یہی چاہتی ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَ اِنْ اَحْكَمْتُمْ بَيْنَهُمْ يَمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا
اور جو کچھ اللہ نے اتارا اس کے مطابق ان میں
تَتَّبِعِ اَهْوَاٰهُمْ وَاَحْذَرُهُمْ اِنَّ يَفْتِنُوْكَ
حکم کرو اور ان کی خوشی پر مست چلو اور ان سے
عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ -
بچتے رہو کہ تمہیں بہکان دیں کسی ایسے حکم سے
جو اللہ نے تم پر اتارا۔ (المائدہ - ۴۹)

اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ تمام لوگ اس حقیقت کو شعوری طور پر سمجھیں اور یقین کریں کہ

شریعت باطل و بیکار پر مبنی نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر حق ہے۔

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ
الْمُضْتَرِّينَ۔ (البقرة۔ ۱۳۷)

حق وہی ہے جو تمہارا رب کہے پھر تم شک لانے
والے نہ بنو۔

سوائے اللہ کے کسی کی حکومت نہیں۔

(یوسف۔ ۲۰)

لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔

اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے۔

(القصص۔ ۸۸)

قانون انسانی زندگی کے بہت سے گوشوں کا احاطہ کر سکتا ہے لیکن اگر اس پر ایسی روہانی
چھاپ نہیں جو اسے ہیبت اور احترام فراہم کرے تو اس کا اثر محدود و ناقص ہی رہے گا۔
قانون تنہا معاشرے کو تحفظ اور یقین فراہم نہیں کر سکتا۔

لیکن آسمانی شریعت ایسا کرتی ہے کیونکہ اس کو ماننا اللہ کے آگے تسلیم خم کرنا ہوتا ہے
اور ہر بڑے چھوٹے کام میں مکمل سپردگی ہی ایمان کا تقاضا ہے۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى
اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ
يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا۔

ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب ان میں
فیصلہ کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی
طرف بلا یا جائے تو کہیں کہ ہم نے سن لیا اور
حکم مان لیا۔

(النور۔ ۵۱)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يَحْكُمُوا بِكَ
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي
أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا
تَسْلِيمًا۔

سو تمہارے رب کی قسم ہے کہ وہ مومن نہیں
ہوں گے یہاں تک کہ تم کو ہی منصف مانیں
اس جھگڑے میں جو ان کے درمیان اٹھے پھر
تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں میں تسکین نہ
پائیں اور خوشی سے قبول کریں۔

(النساء۔ ۶۵)

اسی لیے آسمانی شریعت کا رعب و نفاذ ظاہری طور پر بھی ہوتا ہے اور باطنی طور پر
بھی کیونکہ اس کا نفاذ کسی ایسی طاقت کے خوف سے نہیں ہوتا جس کو دھوکا دیا جاسکے۔

بلکہ اس ذات کے ڈر سے ہوتا ہے جو ظاہر و پوشیدہ تمام چیزوں کو جانتی ہے۔

خود مجرم ہی سب سے پہلے اس کی سزا کے آگے جھک جاتا ہے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ کے حکم کو ٹالنا نہیں جاسکتا، بلکہ وہ کوشش کرتا ہے کہ اسے دنیا ہی میں اپنے جرم کی سزا مل جائے تاکہ آخرت کے عذاب سے بچ جائے۔

یہ آسمانی قانون کا وہ امتیازی وصف ہے جس سے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین عاری ہوتے ہیں۔

پھر اللہ کے حکم کا نفاذ ایسا فرض ہوتا ہے جس کی ادائیگی میں ریاست اور معاشرہ تعاون کرتے ہیں اور اسے اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں۔ اس طرح مجرم کے گرد حصار تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے جرم کے نتائج سے بھاگ نہیں پاتا خود اپنے قریب ترین لوگوں کے پاس بھی اسے پناہ نہیں مل سکتی کیونکہ سبھی اسے سزا کے لیے سپرد کر کے اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل کرنے کے خواہاں ہوں گے۔

دوسری صورتوں میں مجرم کی گرفتاری کے لیے انعام تک مقرر کیے جاتے ہیں پھر بھی مجرم کو چھپانے والے مل جاتے ہیں۔ کیونکہ قانون کی حرمت دلوں کی گہرائیوں میں نہیں ہوتی بلکہ بعض لوگ تو اس کے سزا کے مستحق ہونے یا اس قانون کی افادیت ہی کے مسائل نہیں ہوتے۔

یہ کتنی مشکل بات ہے کہ قانون کے نفاذ کا تعلق صرف مادی اقتدار کے ساتھ مربوط ہو اور اگر کوئی جرم اقتدار کی پکڑ سے باہر ہو۔ اور ایسا کتنا زیادہ ہوتا ہے۔
تو قانون بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

کیا افسروں اور سپاہیوں کی فوج اس مہم کو سرانجام دے سکتی ہے؟

اور اگر ایسا ممکن بھی ہو جائے تو کیا مطلوبہ بلند معیار حاصل ہو سکتا ہے؟

اور پھر اس سلسلے میں کتنا بوجھ اٹھانا پڑے گا؟

اسلامی معاشرے میں دینی شعور حیرت انگیز نتائج پیدا کرتا ہے۔

ایک آدمی شہوت کے دباؤ میں آکر زنا کا جرم کر لیتا ہے۔

کسی نے اسے دیکھا بھی نہیں۔

لیکن جب ہوش میں آتا ہے اور اس کا ضمیر جاگتا ہے تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ مجھ پر حد جاری کر دیجیے۔

آپ نے دیکھا؟ ایک مومن جب دیکھتا ہے کہ اس سے گناہ سرزد ہو گیا تو وہ اپنی ذمے داری سمجھتا ہے کہ سزا پانا کر اپنے آپ کو پاک کر لے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں فرمان جاری ہوتا ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملا جائے۔ حضرت عمرؓ رات میں لوگوں کا حال معلوم کرنے کے لیے گشت کرنے نکلتے ہیں تو ایک مکان سے آواز سنائی دیتی ہے۔ ماں بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں پانی ملا دو۔

بیٹی کہتی ہے: نہیں، امیر المومنین نے منع کیا ہے۔

ماں کہتی ہے: امیر المومنین کیا یہاں دیکھ رہے ہیں؟

بیٹی جواب دیتی ہے: اگر امیر المومنین نہیں دیکھ رہے ہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہے۔

ایک نوجوان عورت کو ایک شخص برائی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اندھیری رات ہے، مکمل تنہائی ہے۔ وہ کہتا ہے یہاں ہمیں سوائے ستاروں کے کوئی اور دیکھنے والا نہیں۔

عورت جواب دیتی ہے: اور ستاروں کا خالق کہاں ہے؟

اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتے والا ضمیر ہی حقیقی قانونی بالادستی کا ضامن ہے۔ جب اس انداز پر قانونی پالیسی بنے گی تو اس کی بنیادیں مضبوط ہوں گی اور تب بھی راحت محسوس کریں گے۔

قانون کا تقدس سب سے پہلے اس کے سرچشمہ پر منحصر ہے اور یہ کہ لوگ اس سرچشمہ سے کتنا تعلق رکھتے ہیں۔ اگر قانون اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو لوگوں کے دل و دماغ میں اس کی حیثیت اسی طرح کی ہوگی جیسے وہ نماز و زکوٰۃ کا جز ہے۔

جو قانون یہاں تک پہنچا ہوا ہو اسی سے حالات مستحکم ہو سکتے ہیں۔

شریعت سب کے مفاد میں ہے کیونکہ اس کی بنیاد رحمت پر ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو آخرت سے پہلے خود اس دنیا میں خوش بخت بنانا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جس بھلائی کا حکم دیا ہے۔ اور وہ بھلائی ہی کا

حکم دیتا ہے۔ — دنیا میں اس کا فائدہ اور آخرت میں اس کا ثواب اس کے کرنے والوں ہی کو ملتا ہے۔ اور جس برائی سے اللہ نے روکا ہے۔ — اور وہ برائی ہی سے روکتا ہے۔ — وہ بندوں کو دور یا نزدیک اور ظاہری یا پوشیدہ تکلیف سے انہیں بچانے کے لیے ہی ہے۔ دین اور شریعت مخلوق پر خدا کی رحمت ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟

کچھ لوگ شریعت کی سزاؤں کی سختی اور بے رحمی کی باتیں کرتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ ان سزاؤں کے ذریعہ ان لوگوں سے انتقام لینا اور اپنے دل کو سکون دینا چاہتا ہے جنہوں نے اس کے ساتھ کوئی برائی کی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں زیادہ بالاتر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آسمانی سزائیں لوگوں کے لیے رحمت اور معاشرے کے لیے بھلائی کا ذریعہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ جب ایک قاتل کا خون بہانے کی ہدایت دیتا ہے تو اس لیے کہ ہزاروں جائیں بچ سکیں اور جب وہ ایک چور کا ہاتھ کاٹنے کی ہدایت دیتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ روئے زمین پر امن و امان کا بول بالا ہو۔

شاید دنیا میں اس سے بڑا جھوٹ کوئی نہیں ہوگا کہ سزائے موت کو منسوخ کرنے کے لیے انسانی جذبہ ہمدردی کے نعرے لگائے جائیں۔

اس طرح کی بات مان لی جائے تو دنیا سے امن و انصاف ختم ہو جائے گا اور ہر جگہ سرکشی و انتشار پھیل جائے گا۔

شروع ہی سے انبیاء کی لائی ہوئی آسمانی شریعتیں و انشعاب رحمت کا تقاضا ہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کے لیے پاک چیزیں جائز کی تھیں لیکن جب انہوں نے بغاوت اور جرائم پسندی کی راہ اختیار کی تو ان پر سختی کی گئی۔

فَإِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا أَمْرَهُ وَكُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا أَمْرَهُ
وَأَسِعْ وَلَا يَرْضَ عَنْهُ مَنِ الْعَمَلِ رَبُّكَ رَحِيمٌ رَحِيمٌ وَسِعَتْ سَعَتُهُ
وَأَسِعَتْ سَعَتُهُ وَلَا يَرْضَ عَنْهُ مَنِ الْعَمَلِ رَبُّكَ رَحِيمٌ رَحِيمٌ

المُجْرِمِينَ - (الانعام - ۱۲۷) لوگوں سے اس کا عذاب نہیں ملے گا۔

آسمانی قانون جب ایک مجرم کو پکڑتا ہے تو اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ پوری انسانی جماعت کو زندگی کا تحفظ اور امن و سکون فراہم کیا جائے۔

مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ
أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ
أَوْ فسادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ
النَّاسَ جَمِيعًا -

اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھا کہ جو کوئی
ایک جان کو، بلا کسی جان کے عوض یا بلا ملک
میں فساد برپا کیے قتل کرے تو گویا اس نے
سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔

(المائدة - ۳۲)

جی ہاں! قتل پوری انسانیت کے خلاف جارحیت ہے اور اگر فیصلہ کن سزا کے ذریعہ
اس کی روک تھام نہ ہوئی تو ایک ایک کمر کے وہ نہ جانے کتنی جانوں کو نگل لے گی۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي
الْأَلْبَابِ (البقرہ - ۱۷۹) اے عقلمندو!

زمین بارش ہو جانے سے سرسبز ہو جاتی ہے اور فصل دیتی ہے جس سے اناج، پھل
اور سبزیاں وغیرہ حاصل ہوتی ہیں۔ یہ بارش کی برکت ہے۔

لیکن آسمانی سزاؤں کی برکت اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جسے کچھ لوگ سمجھ نہیں پاتے۔
حدیث میں آتا ہے کہ:

”زمین پر کسی شرعی سزا کا نفاذ اہل زمین کے لیے اس سے زیادہ بہتر ہے کہ چالیس
روز تک بارش ہو“ (نسائی)

امن و انصاف کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے مزید ہوتا ہے:

”انصاف کرنا لے امام (حاکم) کا ایک دن ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے“ (طبرانی)



شریعت کے احکام، اہل ایمان جن کے مکلف بنائے گئے ہیں، ان کے لیے بیڑیوں کی
حیثیت نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی اداگی کی ضمانت ہیں۔

دین کو پریشان کن فرائض و اعمال کا مجموعہ سمجھنا غلط ہوگا۔

دین تو نظام اور چاق و چوبند رہنے کا نام ہے جو لوگ کاہلی یا انتشار سے مانوس ہیں وہ ان مطالب کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ حق کے اقرار اور درجہ کمال تک پہنچنے کی کوشش ہے۔ اگر کوئی شخص زمین میں درخت لگائے تو اس کی نشوونما کے لیے توجہ درکار ہوتی ہے پھر نفس کی تربیت، فضائل کے سانچے میں ڈھالنے اور گھٹیا چیزوں سے اسے بچانے کے لیے توجہ اور محنت درکار نہیں ہوگی؟

پھر بھی اگر معاملہ مشقت و تنگی تک پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ اسے دور کر کے آسانی فراہم کر دیتا ہے۔

عزیمت کے کاموں کے ساتھ رخصت بھی ہے جسے پانی نہ مل سکے وہ تیمم کر لے جو سفر میں ہو نماز ہلکی کر لے، جو ریض ہو جائے وہ صحت مند ہونے کے بعد روزے رکھ لے جو پاکی کی حالت میں موزے پہن لے وہ سفر کی حالت میں تین روز تک ورنہ چوبیس گھنٹے تک وضو کرتے وقت پاؤں دھونے کے بجائے صرف موزوں پر مسح کر لے۔

ضرورت کے وقت کچھ چیزیں وقتی طور پر مباح ہو جاتی ہیں۔

اگر کسی سے زبردستی کلمہ کفر کہلوا دیا جائے تو اس سے مواخذہ نہیں ہوگا۔

مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی جبکہ اس کا دل ایمان پر برقرار رہے بلکہ وہ جو دل کھول کر منکر ہوئے ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

پھر جو کوئی مجبور کر دیا جائے، نافرمانی اور زیادتی نہ کرے تو تمہارا رب بڑا مہربان ہے اور اللہ

نہایت مہربان ہے۔

الْأَمَنُ أَكْرَهُ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ
وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ
صَدْرًا فَغَلَبَهُمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ
وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (النحل - ۱۰۶)

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ
فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

(الانعام - ۱۱۳۵)

چونکہ ضرورت ممنوع چیزوں کو عارضی طور سے اور مجبوری میں مباح کرتی ہے دائمی اور اختیاری طور سے نہیں اس لیے جو لوگ اسلامی معاشرے میں سودی نظام کو ضرورت

کی بنیاد پر مباح قرار دیتے ہیں وہ بالکل غلطی پر ہیں کیونکہ وہ اس معاشرے کی بنیاد حرام پر قائم کمر کے ایک حرام چیز کو دائمی طور پر حلال کرنا چاہتے ہیں۔

کائنات کے حقائق اور سائنسی اصولوں کی طرح شریعت کا اطلاق بھی عام ہے کسی علاقہ اور زمانے میں وہ تبدیل نہیں ہو سکتی۔ جبکہ دنیاوی قانون مختلف قوموں اور ممالک کے درمیان بدلے ہوئے عرف پر مبنی ہوتا ہے۔ خیر و شر کے کسی قابل احترام معیار کا لحاظ کیے بغیر۔

منرب کا شہری قانون زنا کو جائز قرار دیتا ہے اگر وہ طرفین کی رضامندی سے ہو۔ اسی طرح وہ شراب نوشی کو جائز قرار دیتا ہے جب تک شراب کے نشے میں کوئی شخص سرگ پر ٹریفک میں خلل انداز نہ ہو۔

کچھ ممالک میں ایون و چرس کی کاشت کی اجازت ہے۔

گویا بھلائی یا برائی کے فائدے دنیاوی قانون میں بدلے رہتے رہتے ہیں جبکہ شریعت میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔

کبھی عام زندگی کے کسی جز کی اصلاح سے متعلق قانون کامیاب بھی رہتا ہے مگر عام زندگی ایک مکمل اکائی ہے اس کے ایک جز کی اصلاح بقیہ حصوں میں خلل سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ اسی لیے قانون سے جو مقاصد پورے نہیں ہوتے انہیں اخلاقی تعلیمات کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کے خیال میں حقوق و فرائض اور اعلیٰ نمونہ کی تشریح کے ساتھ اخلاق اس اہم انسانی پہلو کی تکمیل کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین سے الگ رہ کر علم اخلاق ریت کا مکان ہو جاتا ہے اور انسانی اقدار کی اصلاح میں قانون سے زیادہ کامیابی نہیں دکھاتا۔

اس لیے شریعت کا تقدس لوٹائے بغیر اور آسمانی احکام کو انسانوں کی فلاح و بہبود اور رہنمائی کا پرانا کردار ادا کرنے کا موقع دیے بغیر کوئی علاج ممکن نہیں۔



صدیوں تک اسلامی شریعت میں فقہی بحثیں انتہائی نمایاں مقام پر فائز رہی ہیں۔

ہمارے ہوشمند اسلاف نے اس میدان میں جو زبردست ورثہ چھوڑا ہے وہ ان کے گہرے علم، فکر و استدلال کی صحت و قوت اور قیاس و استنباط میں مہارت کا ثبوت ہے۔

پھر اس میں جمود آنے لگا اور تقلید کرنے والے علماء پیدا ہونے لگے پھر اس تقلیدی علم کے ماہرین بھی ختم ہو گئے اور ایسے طوطے نمودار ہونے لگے جنہیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیارٹ لگا رہے ہیں۔ اسلامی فقہ گوشہ گنہامی میں چلی گئی۔

دوسری طرف عام زندگی پر اس کا اثر یہ پڑا کہ وہ عقیدہ اور شریعت دونوں سے بیگانہ ہونے لگی۔

اب پھر قانون کے میدان میں استعمار کے خاتمہ کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے اور ماہرینِ قانون اسلامی شریعت کے عظیم سرچشموں کی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں اور ان کے حسن و خوبی سے آگاہ ہونے لگے ہیں۔

سرکردہ شامی عیسائی ماہرِ قانون علامہ فارس الخوری کہتے ہیں:

”محمدؐ دنیا کی عظیم شخصیات میں سب سے عظیم شخصیت کے حامل تھے۔ دنیا کو ان جیسی کوئی اور شخصیت نہیں ملی۔ وہ جو دین لائے وہ سب سے مکمل اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ دین ہے۔ اسلامی شریعت نے چار ہزار علمی، سماجی اور قانونی مسائل کا خزانہ چھوڑا ہے انصاف پسند ماہرینِ قانون اسلامی شریعت کی فضیلت تسلیم کرنے اور یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اس کے اصول عقل کے ساتھ ہم آہنگ اور سائنسی حقائق اور انتہائی ترقی یافتہ نظاموں کے مطابق ہیں۔“

بنانی عیسائی ماہرِ قانون پروفیسر سلیم باز لکھتے ہیں:

”میں پورے اطمینان کے ساتھ اپنے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ اسلامی فقہ انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے یورپ کے ممالک اور مسلم علاقوں کی لائبریریوں میں موجود کتابیں اس بات کا تین ثبوت ہیں۔ اسلامی فقہ کے جوائنٹلیکلو پیڈیا ان لائبریریوں میں موجود ہیں وہ ہزاروں زبردست علماء کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ انصاف کے تقاضوں اور انسان کی ضرورتوں سے متعلق کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کسی مسلم فقیہ کا قول

”موجود نہ ہو“

مشہور یورپین ماہر قانون سائیلانا اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں:
 ”فقہ اسلامی میں وہ سب کچھ موجود ہے جو مسلمانوں کے شہری قوانین کے لیے کافی
 ہو، اگر ہم یہ نہ بھی تسلیم کریں کہ پوری انسانیت کے لیے کافی ہے“
 ہارورڈ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہوکنگ اپنی کتاب ”عالمی سیاست کی روح“
 میں لکھتے ہیں:

”میں اپنے آپ کو حق پر محسوس کرتا ہوں جب میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اسلامی شریعت
 میں وہ تمام اصول موجود ہیں جو ترقی کے لیے ضروری ہیں“
 ڈاکٹر ازیو کوانسا باٹو کہتے ہیں:

”فقہ اسلامی بہت سی بحثوں میں یورپین قوانین پر فوقیت رکھتی ہے بلکہ وہ دنیا کو
 سب سے ٹھوس اور مستحکم شریعت دیتی ہے“
 فرانسیسی پروفیسر لامیر لکھتے ہیں:

”اسلامی شریعت میں موجود کتابوں کا لامتناہی ذخیرہ موجود ہے یہ ایسا چشمہ ہے
 جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ عہد وسطیٰ کی اسلامی شریعت اور اسلامی تہذیب کی تاریخ نے موجودہ
 عیسائی تہذیب کو بہت سارے عام اصول دیے ہیں“

جرمن ماہر قانون جوزف کوہلر ڈاکٹر محمود فتحی کی کتاب ”فقہائے اسلام کے نزدیک حق
 کے استعمال میں ”جبر“ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”جرمن اس بات پر بہت نازاں تھے کہ ۱۷۷۶ء کے شہری قانون میں انہوں نے پہلی بار
 ”جبر“ کا نظریہ ایجاد کیا۔ لیکن اب یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ فقہائے اسلام بہت پہلے آٹھویں
 صدی عیسوی ہی میں اس کے بارے میں کافی بحث کر چکے ہیں اب جرمنوں کو چاہیے کہ وہ
 اس نظریہ کے تعلق سے فخر کرنا ترک کر دیں اور یہ اعزاز ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جنہوں
 نے جرمنوں سے دس صدیاں پہلے اسے جان لیا تھا۔ اور یہ تھے اسلامی شریعت کے علمبردار“
 ویانا یونیورسٹی میں لارنس کیٹی کے ڈین پروفیسر سیرل نے ۱۹۲۷ء کے دوران حقوق سے متعلق

کائفنس میں کہا تھا:

”انسائیت کو اس پر فخر ہے کہ محمدؐ جیسا کوئی شخص اس سے اپنی نسبت کرے، اُن پر ۷ ہونے کے باوجود انھوں نے ایک ہزار برس سے بھی زیادہ پہلے ایسی شریعت پیش کی جس کی چوٹی تک ہم اہل یورپ اگر دو ہزار برس بعد بھی پہنچ جائیں تو انتہائی خوش نصیب ہوں گے۔“

۱۹۲۷ء کے دوران لاہے میں قانون سے متعلق بین الاقوامی کائفنس میں چوٹی کے ماہرین قانون اور جدید قانون کے ممتاز علماء اکھٹا ہوئے تو کائفنس کو اسلامی شریعت کی فضیلت کا اعتراف کرنا پڑا اور یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ایک زندہ شریعت ہے جو تہذیب کے ساتھ قدم بقدم چل سکتی ہے اور زمانہ کی پیش رفت کا ساتھ دے سکتی ہے نیز یہ کہ موجودہ قانونی ماخذ میں اسے متاز جگہ دی جانی چاہیے۔

آخری بات

مسلمانوں کے حالات صدیوں سے خراب ہیں۔ ایک لمبی مدت تک وہ دنیا کی بہترین قوم رہے۔ پھر ان کا پلا کچھ ہلکا ہوا اور وہ دوسری قوموں کے برابر رہ گئے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ بہت سی قوموں سے پیچھے ہو گئے۔ یہ خام خیالی اور غلط فیصلہ ہوگا کہ ہم اس کی ذمہ داری اسلام پر ڈالیں۔ مسلمان بلندی کی چوٹیوں تک اس وقت پہنچے تھے جب اسلام کے ساتھ ان کا تعلق مضبوط تھا۔ جب یہ تعلق کمزور ہو گیا اور دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہو گیا تو وہ دھیرے دھیرے پیچھے جانے لگے یہاں تک کہ جو لوگ ان سے منزلوں پیچھے تھے وہ منزلوں آگے نکل گئے۔

اس کے دو ہی اسباب ہیں:

- ۱۔ زندگی کے اہم میدانوں میں اسلامی ہدایات کو پوری وضاحت کے ساتھ نہ سمجھنا اور ان کی سنگین خلاف ورزی۔
- ۲۔ اسلامی حقائق کے اہم معانی و مطالب کو اس طرح الٹ پلٹ دینا کہ بہت سی بدعتیں اور اوہام و خرافات رائج ہو گئے۔ یہاں تک کہ متقیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کی کوشش ان طریقوں سے کرنے لگی جو اللہ تعالیٰ نے بتائے ہی نہیں تھے۔

صدیوں میں جو کچھ برباد ہوا ہے وہ برسوں اور مہینوں میں درست نہیں ہو سکتا اس کے لیے کافی لمبی مدت اور کافی طویل اور صبر آزماء جدوجہد چاہیے۔
دین اپنے عروج کے دور میں دلوں کے نور، عمل کی درستگی، عہد و امانت کی پاسداری اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے ساتھ سچائی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ نئی نسلیں آتی ہیں تو وہ دین کو محض زبانی جمع خرچ کم ہمتی، ظاہر داری اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کا عنوان بنا لیتی ہیں۔
بسا اوقات دینی رسموں اور روایات کو دلوں کی بیماریوں اور ان کی خواہشات و مقاصد کی پردہ پوشی کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔

پہلی صورت میں دین اس کا حقدار ہوتا ہے کہ اس کا بول بالا ہو اور اس کی استقامت ترقی کرے۔ دوسری صورت میں زندگی فریب خوردہ اور فریب کار ظاہری دینداروں کا شکار ہو کر بلندی سے پستی اور کامیابی سے ناکامی کی طرف پہنچتی ہے۔
فیصلہ کن قانون الہی ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْتِرُ مَا يَقْرُمُ حَسْبِي
وَهُوَ بَدَنِيں جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔
السُّرْمَى قَوْمِ كِي حَالَتِ نَهْنِيں بَدَلْتَا جَبْتِك
وَهُوَ بَدَنِيں جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔

(الرعد - ۱۱)

صورت حال کی اصلاح کے لیے ایک مدت ضروری ہے جس میں سنجیدگی پیدا ہو، ظلم حق سے اغداری و قواداری سے اور کند ذہنی ذہانت سے بدل جائے۔
کسی جاہل کو یہ سمجھانے کے لیے کہ وہ جہالت کا شکار ہے، ایک مدت چاہیے پھر اس جہالت کو ختم کرنے کی ضرورت کا قائل بنانے کے لیے ایک مدت چاہیے۔
پھر ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں پہنچنے کے لیے ایک مدت چاہیے۔
پھر ماضی سے ملے ہوئے شدید خواب غفلت اور امراض سے نجات پانے کے لیے ایک مدت چاہیے۔

اگر ایک پھل دار درخت کو لگانے، اسے پروان چڑھانے اور اس میں پھل آنے تک برسوں کا وقت لگتا ہے تو کسی شخص کی تربیت اور کسی قوم کو زندہ کرنے کے لیے ظاہر ہے بہت وقت چاہیے۔

لیکن سچے اور مخلص داعیوں کو یہ بوجھ اٹھانا ہی پڑتا ہے اور قوموں کے معاربھاری بوجھ ہی اٹھاتے ہیں۔

کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا یہ قول سنتے ہیں کہ:

قُلْ اللَّهُمَّ مَالِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي
الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ
مِمَّنْ تَشَاءُ (آل عمران - ۲۶)

کہو اے اللہ! سلطنت کے مالک تو جس کو
چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت
چھین لے۔

تو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مشیت الہی قوموں کی تقدیریں اچانک ہی بدل دیتی ہے۔

میں نے اس طرح کے ایک آدمی سے کہا: اس طرح کا بچکانہ طرز فکر تھوڑا دو۔

فلسطین میں ایک قوم سے اقتدار چھینا جانا اور دوسری قوم کے سپرد کیا جانا سوچا اس
برسوں سے ہونے والی تیاریوں کا نتیجہ تھا۔ اب اگر کوئی قوم نقصان کے بعد فائدہ کی منزل
تک پہنچنا اور اپنا ملک بحال کرنا چاہتی ہے تو پہلے اسے پوری باریک بینی سے چھان بین
کرنی ہوگی کہ جو کچھ ہوا کن اسباب کی بنا پر ہوا، پھر کامیابی دلانے والے کاموں کے ذریعہ
مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی تیاری کرنی چاہیے اور اس سلسلہ میں پامردی اور مستقل مزاجی
سے کام لینا بھی ناگزیر ہوگا۔

جو اکیلے والے تو بے سوچے سمجھے نفع نقصان کی بازی کھیل سکتے ہیں لیکن زندگی کے

عملی میدان میں اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔



ملت اسلامیہ جتنی دین سے ناواقف ہے اتنی ہی دنیا سے بھی نا بلند ہے۔ عالم غیب
کے تعلق سے اسے جتنی بھول ہے اتنی ہی ظاہری دنیا کے تعلق سے بھی ہے۔

کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو کہ ملت کی ذہنی تھکاوٹ اور فقر و غربت کی وجہ

یہ ہے کہ وہ دنیا کے بجائے آخرت کی تعمیر میں مشغول و منہمک ہے اور جنت کے حصول کی کوشش اسے دنیاوی زندگی کے لیے کوشش کی فرصت ہی نہیں دیتی۔

ناکامی کا شکار تو وہ دونوں میدانوں میں ہے۔ وہ اپنے پیغام کی ادائیگی ہی سے عاجز و درماندہ رہ گئی ہے۔ اسی لیے یہ ساری پیمانہ نگاری آئی اور مسلم ممالک استعمار کے شکنجوں میں پھنسے۔

ملت کو علم و معرفت کی ایسی تیز موجوں کی ضرورت ہے جو اسے از سر نو زندہ کر دیں اسے آسمان سے نازل ہونے والی اور زمین سے نکلنے والی ہر چیز کی پہچان کرادیں۔ علم کے تعلق سے اس کی پیاس اور نرپ بہت شدید ہے۔ اگر علم و معرفت کے سیلاب نے اسے سیراب نہ کیا تو وہ زندگی سے خالی ایک وحشت ناک صحرا میں تبدیل ہو کر رہ جائے گی۔ علم ہی کی طرح تربیت بھی ضروری ہے۔

علمی سطح کی بلندی اخلاق و کردار کی بلندی سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ علم انسانی عظمت کا حصہ اسی وقت بنے گا جب روشن ضمیری اور با مقصدیت کے ساتھ ہو۔ بدیتی اور خواہشات نفس کی پیروی کے ساتھ علم بلندی کے بجائے پستی تک ہی پہنچا سکتا ہے۔

اسی لیے دین پہلے نفس کے تزکیہ اور اس کے رجحانات کی اصلاح چاہتا ہے تاکہ اس کے مضرت رساں پہلو ختم ہو جائیں۔

جب دین اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا تو وہ رہنمائی کرنے اور صحیح راستے پر باسانی چلانے کے لائق ہو جائے گا۔ یہ عظیم مقصد حاصل کیسے ہو؟

بلند اخلاق و کردار، نظریاتی مطالعہ یا فوجی احکام سے تو تشکیل نہیں پاسکتے۔ یہ معاملہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ حکم دینے اور روکنے نیز ترغیب دینے اور ڈرانے کے ساتھ ماحول اور اس کے حالات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔

یہ میرا تجربہ ہے کہ غربت و تنگی بکا ماحول اخلاق و کردار کو پست اور کشادگی و بے نیازی

کا ماحول انہیں بلند بناتا ہے۔ اسی طرح ظلم و استبداد کا ماحول انہیں خراب کرتا ہے اور آزادی و عزت کا ماحول انہیں بہتر بناتا ہے۔

اخلاق و کردار جب تک کتابوں کے صفحات پر ہیں یا مقررین کی زبانوں پر خوشنما الفاظ کی صورت میں ہیں ان کی حیثیت وہی ہے جو بہترین خوبصورت شیشوں اور پمکنگ میں قیمتی دواؤں کی ہوتی ہے جب تک ان دواؤں کو پورے اہتمام سے استعمال نہ کیا جائے وہ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں اسی طرح اخلاق و کردار کو انسانی وجود میں عمل آجانا بسانا ناگزیر ہوتا ہے تاکہ زندگی پر ان کے اثرات مرتب ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛

وَنَزَّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ
وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ۔
اور ہم قرآن میں سے اتارتے ہیں جس سے ایمان والوں کے روگ و فح ہوں اور ان کے لیے

رحمت ہو۔ (بنی اسرائیل - ۸۲)

بلاشبہ قرآن مختلف انسانی امراض کے لیے شفا رکھتا ہے پھر وہ تو میں جو اس کتاب کی علمبردار ہیں کیونکہ مختلف سنگین بیماریوں میں گرفتار ہیں؟ وجہ یہی ہے کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح پانی میں ڈوبنے سے گھلا س پانی سے بھر جاتا ہے اسی طرح بغیر کسی جدوجہد کے دلوں میں ایمان و احسان بھر جانا بھی ممکن ہے۔

خدا کی قسم یہ پاگل پن ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایمان اس طرح سے مکمل ہو یا حتیٰ اس طریقے سے باطل پر غالب ہو سکے۔

انسانی وجود میں جو صلاحیتیں موجود ہیں ان کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح جسمانی ورزشوں سے نرم پٹھے طاقتور ہوتے ہیں اسی طرح داخلی صلاحیتوں کا بھی حال ہے۔

مثلاً ابتدائی طور پر انسان کی فکری صلاحیت معمولی ہوتی ہے پھر سازگار ماحول میں حیرت ناک تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے شروع میں متاثر زیادہ ہوتی ہے خود اثر انداز نہیں ہوتی۔ پھر اس پر توجہ مرکوز رکھنے اور مشق سے مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہاں تک کہ جو شخص غور و خوض میں لگا رہتا ہے اس کی فکری شخصیت مکمل ہو جاتی ہے اور صاحبِ فکر بن جاتا ہے جو ایسا نہیں کرتا وہ عام آدمی رہ جاتا ہے۔

یہی حال تمام انسانی صلاحیتوں کا ہے یہاں تک کہ جسمانی ضرورتوں کا بھی۔ اگر انسان انہیں دبانے کی کوشش کرے تو وہ دھیرے دھیرے ماند پڑتی چلی جاتی ہیں اور اگر ان کی حوصلہ افزائی کرے اور اس کی خصوصی مشق کرتا رہے تو وہ طاقتور ہوتی چلی جاتی ہیں اور آگ کی طرح انسان پر چھا جاتی ہیں اور اس کی جیا و پیا کیزگی کو ختم کر دیتی ہیں۔ یہی انسانی فطرت کے تعلق سے دین کا حال بھی ہے وہ انسان کے اندر موجود ہوتا ہے لیکن ابتدائی طور پر کمزور ہوتا ہے اسے پروان چڑھانے کے لیے اپنے طرز کی مشق کی ضرورت ہوتی ہے جو اس میں زندگی، طاقت اور گرمی پیدا کرے یہاں تک کہ خواہشات و رجحانات پر غالب آجائے اور اس میں خود زندگی سے زیادہ گہرائی و وسعت پیدا ہو جائے۔ دین کے لیے مشق کا ذریعہ عبادات ہیں اور ان کا طریقہ اور کیفیت ہمیں اللہ تعالیٰ سے ملی ہے۔ جب دین جو تمام فضائل کی سرچشمہ ہے کے پوجے کو اس طرح نشوونما کی ضرورت پڑتی ہے تو اخلاق و کردار کے ایک ایک پہلو کی نشوونما کے لیے کیوں نہ ضرورت ہوگی۔؟

معاملہ لمبی مشق اور باقاعدہ علاج چاہتا ہے۔
اور جدوجہد کے لیے صحیح طریقہ کار اور صحیح رخ بھی ناگزیر ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے

تصنیف
سید حامد محسن

ترجمہ
ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

تصحیح و تخریج
ابو عبد اللہ محمد

مکتبہ قادیان

نصر اللہ امرأ سمع منا حديثا فبلغه (حدیث)

تذکرۃ المحدثین

حصہ دوم

اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی علمی و حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

ضیاء الدین اصلاحی

مکتبہ قاسم علی

اسلام پرست

علامہ محمد سید غزالی رحمہ اللہ



ترجمہ

ابو مسعود اظہر ندوی

